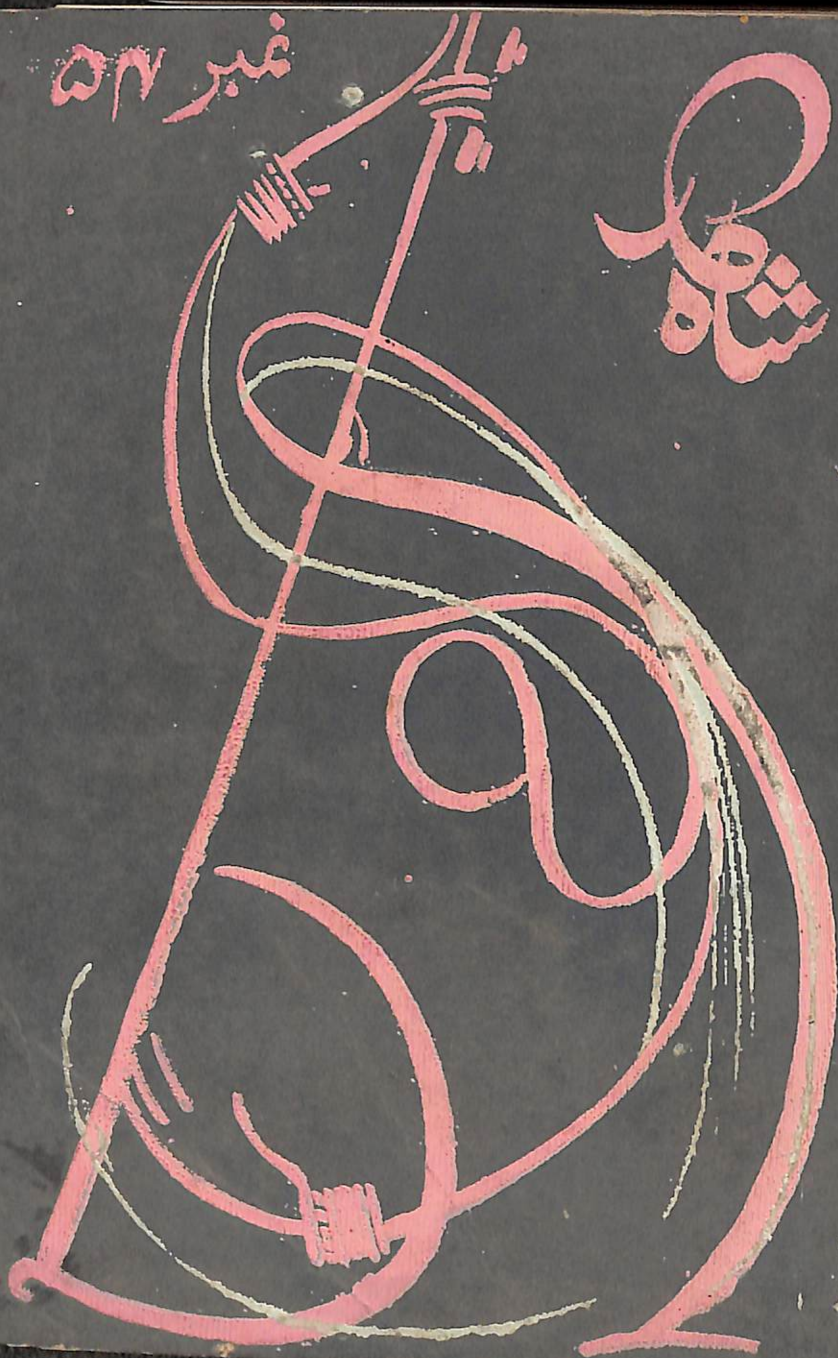

نمبر ۵۸
شاہد

دو یا تین بچّے ـــــ بس....



فیملی پلاننگ سینٹر کی پہچان : لال تکون

اُردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار

نمبر ۵۴

مُدیر —

محمود احمد ہنر

قیمت
ایک رُوپیہ

سالانہ
دس رُوپے

سنہ ۱۹۶۷ء

دفتر شاہکار، ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳

بمبئی آفس — ڈائمنڈ لاج، سکنڈ پیر خاں اسٹریٹ، بمبئی ۸۔ فون نمبر ۳۷۷۹۶۵

ضروری گذارش

شاہکار ۱۹۵۷ء میں ۱۴۴ صفحہ کی ضخامت اور ایک روپیہ قیمت میں منظر عام پہ آیا تھا۔ آج جب قیمتیں دو چند ہو چکی ہیں قیمت میں اضافہ بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

استصواب رائے پہ قارئین کا اصرار ہے کہ ضخامت میں کمی نہ کی جائے بلکہ قیمت میں اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن ہمیں بجنسہٖ ضخامت میں کمی یا قیمت میں اضافہ مناسب نہیں معلوم ہوا بلکہ ضخامت کے ساتھ ساتھ قیمت میں اضافہ قارئین کے لئے مفید اور ہمارے خسارہ کی تکمیل میں کسی حد تک معاون ہو گا اس لئے زیرِ نظر شمارے سے ہی صرف ضخامت میں ۱۶ صفحہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اہم اعلان:۔ ناولٹ نمبر کے بعد شمارہ ۵۶ یعنی فروری ۶۸ء کے شمارے سے ایک کاپی کی قیمت 1.25 اور زرِ سالانہ 13.20 (بہ شمول دو خاص نمبروں کی رجسٹری فیس) ہوگا۔ **مستقل خریدار** ۳۱ جنوری تک زرِ سالانہ =/11 بھیج کر مدتِ خریداری میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔ جن حضرات کا زرِ سالانہ صرف =/10 جمع ہے وہ مزید =/1 ناولٹ نمبر اور احتشام حسین نمبر کی رجسٹری فیس کے لئے ۱۵ جنوری تک ضرور بھیج دیں۔ عدم وصولی کی صورت میں ناولٹ نمبر 1.25 کی وی پی سے روانہ ہو گا۔

مکتبہ کا قیام:۔ معیاری اور ادبی کتابوں کا خاصہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔ ممکنہ رعایت اور پوری سہولت کے لئے اپنی مطلوبہ کتابیں ہم سے طلب فرمایئے (مختصر فہرست ملاحظہ فرمایئے صفحہ ۱۵۹)

اشاعتی پروگرام:۔ مکتبہ شاہکار کا قیام اشاعتی پروگرام کی پہلی کڑی ہے۔ نمائندہ معیاری اور ادبی تصانیف کی اشاعت مکتبۂ شاہکار کی خصوصیت ہو گی۔

منیجر شاہکار

ترتیب

مضمون

محمود احمد ہنر ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ 'شاہکار' ۱۳۴ الکشی بازار الہ آباد سے شائع کیا

اپنی بات

"شاہکار" کے پچھلے نمبر کی طباعت کے سلسلے میں اکثر قارئین نے شکایت کی۔ ہمیں افسوس ہے اور خود مالک مطبع صاحب کو افسوس ہے کہ کارکنوں کی بے پروائی نے انھیں اور ہمیں شرمندہ کیا۔ آئندہ کے لئے انھوں نے یقین دلایا ہے کہ انھیں ہم سے یا ہمیں قارئین سے شرمندگی نہ ہوگی اور اسی بھروسے پر یہ نمبر انھیں دیا جا رہا ہے۔

تاخیر اشاعت کی شکایت بھی بالکل بجا ہے اور اس سلسلے میں بھی ساری ذمہ داری اپنے سر لے کر ہم معذرت خواہ ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی رسالے کو قارئین کے ہاتھوں تک پہنچنے کے لئے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاتب صاحب کی ناسازیٔ طبع سے لے کر پریس کی مشین یا مشین مین کے جا و بیجا نخرے تک کہیں بھی ادارہ بے بس ہو سکتا ہے اور یہ بے بسی و بیچارگی ہر اُس مدیر یا ادارہ کا مقدر رہے جو محض ادب کی خدمت کا جذبہ لے کر اس میدان میں آ گیا ہو اور جس کی جیب خالی ہو۔ تاہم خدا نے چاہا تو بہت جلد آپ کی یہ شکایت بھی رفع ہو جائے گی۔

اس نمبر کے بارے میں بھی ہم آپ کی رائے جاننا چاہیں گے۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ "شاہکار" کا ہر قدم ترقی کی منزل کی طرف بڑھتا رہے گا۔ یہ نمبر اس کا ثبوت ہے۔ سرورق تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس کی سادگی و پرکاری آپ کو کیسی لگی؟ مالی اعتبار سے ہمارے لئے فن طباعت کا یہ تجربہ بھی مہنگا ہے لیکن آپ کو یہ جدت پسند آئے تو ہمیں خوشی ہوگی۔ اس نمبر سے صفحات میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے اور اس اضافہ کے باعث محصول ڈاک ڈیوڑھا ہو جائے گا' اس لئے قیمت میں بھی اضافہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اگلا نمبر ناولٹ نمبر ہوگا۔ اس کے بعد سالانہ قیمت صرف دو روپے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ناولٹ نمبر کے لیے شوکت صدیقی، جمیلہ ہاشمی، اقبال متین اور جیلانی بانو کے جو ناولٹ منتخب کیے گئے وہ سب شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ نمبر واقعی ایک خوب صورت ادبی تحفہ ہوگا۔

ناولٹ نمبر کے بعد ہی ہم احتشام حسین نمبر کی تیاری میں لگ جائیں گے۔

یہ نمبر احتشام صاحب کے فن اور شخصیت پر اردو کے بلند پایہ ادیبوں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کے علاوہ خود احتشام کی بہترین تخلیقات کے انتخاب پر مشتمل ہوگا اور ہم اسے ایک مستند ادبی دستاویز کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

محمود احمد ہنر



جمیلہ ہاشمی

اکیلا پھول

دریا کے ساتھ ساتھ چلتی یہ سڑک پہاڑوں کے دامن سے گزرتی اندھیرے میں ڈوبتی ہوئی لگتی ہے، دن کی روشنی بادلوں کی لالی میں بدل گئی ہے اور پانی میں گھلی سُرخی شام کو لہو رنگ بنا دیتی ہے۔ لہریں اور آسمان کا رنگ اور مغرب کی طرف اکیلے تارے کی چمک ایک بے نام اُداسی کے رشتے میں بندھے ہیں۔ سرکنڈوں کے جھنڈ میں رنگ برنگ چڑیاں بسیرا کرتی، شور مچاتی ہیں اور ہوا کی سرسراہٹ میں ملی یہ آوازیں تیلے پن کا ایک تانا بانا سا بُننے لگتی ہیں۔ پرندوں کے جُھنڈ اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے ہیں اور ایک پُر ہول سنّاٹا پتھروں اور دریا، سڑک پر اور فضا میں گونجتا بہتا چلا جاتا ہے۔ سایوں کی طرف دیکھتے ہوئے دم گھٹنے لگا ہے، رات، سڑک کے کنارے کی جھاڑیوں اور سُرخ پھولوں، پانی اور ان ٹوٹی ہوئی بُرجیوں سے نکل رہی ہے جس کے نیچے سے دریا جانے کتنے زمانوں بہا ہے اور نکلا چلا گیا ہے۔ دم گھونٹنے والی خوشبوئیں آوارہ و پریشان خیالوں کی طرح ہر طرف سے یورش کر رہی ہیں۔ جنگل کی باس اندھیرے میں ملتی، گھات سے نکل کر حملہ کرنے والے ڈاکو کی طرح ہے۔ عین مین تمہاری خوشبو کی طرح عطیہ بیگم، جو اچانک کہیں سے نکلتی اور مجھے اپنا دَم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ تمہاری شخصیت یہی باس تھی عطیہ بیگم جو مجھے آج تک مقید کئے ہوئے ہے اور مغرب میں اکیلے تارے کی طرح تمہارا وجود۔ یہ تمہارے وجود کا

المیہ تھا عطیہ بیگم جو آدمی کو بے بس کر دیتا تھا اور تمہارا دیکھنے اور دیکھتے رہنے کا انداز جیسے دریا کے کنارے کی گھاس میں اکیلا پھول ہو کر جھانکے اور اپنے اکیلے پن کا احساس دلائے اور پھر بے چارگی کا بادہ اوڑھے تمہاری تابناک مُسکراہٹ۔

یہی مُسکراہٹ جس کے لئے میں گذر گیا عطیہ بیگم۔ تمہاری تابانی، جو پلکوں کے نیچے سے نکل کر تمہارے چہرے پہ پھیلتی تھی۔ میں نے ہمیشہ تم سے کہا تھا اور مجھے یہ احساس تھا کہ میں تمہاری شخصیت سے مرعوب ہو گیا ہوں، غلط تھا۔ میں نے تمہاری ہمت اور تمہارے باوقار انداز سے ہار نہیں مانی تھی۔ عطیہ بی بی یہ صرف تمہاری مسکراہٹ تھی جو کلی پہ پھول بننے میں گذرنے والی کیفیت کی طرح ہے۔ اس میں حُزن والم کی ایک ایسی نسبت ہے جس کو تم لفظوں کے پیمانے میں نہیں ناپ سکتیں اور پھر تم خود تشنۂ مضراب ساز کی طرح ہمیشہ منتظر۔ مجھے لگتا ہے تم قدیم دیومالامیں آسمانی قوتوں کی مظہر ہو۔ میرے اور اپنے المیہ میں اہم کردار ادا کرنے والی۔

زندگی کی ساری شامیں رنگ و نور، نغمہ و کیف نہیں ہوتیں مگر ایسی شامیں جن میں کچھ ہونے والا ہو، دل کو بُری طرح دھڑکاتی ہیں جیسے کوئی اَن جانی مصیبت نازل ہونے والی ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔ اور اس شام ہوا بھی یہی تھا، دفتر سے گھر آیا ہوں تو میرا جی اچھا نہیں تھا، میں باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ آج کی طرح سنّاٹے کی ایک بجتی ہوئی نوبت تھی جو رہ رہ کر دل کے ویرانے میں گونجتی تھی۔ اس محفل میں میری شرکت ضروری بھی تھی اور اس لئے جب میں دیر سے پہنچا ہوں تو سازندے اپنے ساز مِلا رہے تھے۔ لوگ منتظر تھے۔ اگلی صفوں میں میرے نام کی کُرسی خالی نہیں تھی۔ ہَولے ہَولے رات بھیگتی گئی، آوازیں جادو بھری وادی سے آنے والی صداؤں کی طرح آدمی کے اندر سوئی تانوں کو جگانے لگیں۔ وہ یادگار رات جب لگ رہا تھا زمین و آسمان وجد میں آئے ہوئے ہیں، ہر شئے خاموش ہے اور چپ چاپ منتظر ہے۔ مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا

لگتا تھا۔ تم سمندر کے سامنے اپنے آپ کو جیسے بے بس اور حقیر ذرّہ محسوس کرتے ہو ویسے ہی موسیقی میں اپنے آپ کو ناچیز اور فنا ہوتا پاتے ہو۔ لے اور نے میں بول اور دنیا کی خوب صورتی بہتی ہوئی شوق بنتی ہوئی اور پھر یوں لگتا تھا ساز، روحیں، صدائیں سب مل کر بہہ رہے ہیں۔ ایک دریا تھا جوش و روانی میں ہستی کو سیّال بناتا ہوا اور اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو بہا کر لے جاتا ہوا۔ میں آنکھیں بند کئے تھا اور گانے والوں کے ہاتھوں کی لذت اور رچاؤ بتانے کے انداز سے بے خبر اس گھڑی میں دیوتا بنا ہوا تھا اور خیال کی ساری کثافتیں اور آلودگیاں ڈھل چکی تھیں، اپنے نکھرے ہوئے باطن کے ساتھ جب میں نے تمہیں دیکھا ہے تو اپنی اس المیہ مسکراہٹ کے ساتھ تم مجھے یونانی دیومالا کا کوئی کردار لگیں۔

میں نے پوچھا تھا "تمہیں کہاں جانا ہے بی بی ؟ کہئے تو میں پہنچا آؤں "

"مجھے بہت دور جانا ہے، میری منزل قریب نہیں ہے، آپ کو ناحق تکلیف ہوگی "

میں نے موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا "میری تکلیف کا خیال نہ کریں، آخر کسی طرح تو آپ کو پہنچنا ہی ہوگا نا "

تم نے گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اجنبی آدمی سے تم نے کبھی بات ہی نہ کی ہو۔ اور میں نے سوچا اگر تم ایک دو سال کم کی ہوتیں تو میری نوری کے برابر ہوتیں۔ مجھے اپنی بیٹی میں اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا اور خدا گواہ ہے عطیہ بیگم تم جو میری ہستی کو اپنی روانی میں خس و خاشاک کی طرح بہانا چاہتی تھیں، اگر تم کو میں نے نوری کی طرح کم عقل اور بے بس نہ جانا ہوتا، تم سے تمہاری حفاظت نہ کی ہوتی، اپنے سے تمہیں نہ بچایا ہوتا تو آج میں تمہاری اس مسکراہٹ کی بھینٹ نہ ہوتا۔ تمہیں پاکر میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں مدّتوں بیمار رہا ہوں اور اب روبصحت ہوکر پہلی بار ہواؤں کی نرمی اور گیتوں کو اپنے گرد محسوس کر رہا ہوں جیسے تم رات کا راگ ہو اور میری ہستی پر سے بہہ رہی ہو اور بے نام

خوشبو کی طرح تم نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تم چاندنی بن کر میرے وجود پر پھیل گئیں مگر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔

تمہاری منزل آگئی تو تم نے پچھلی سیٹ پر سے اُتر کر دروازہ بند کر دیا اور بنا شکریہ کا ایک لفظ کہے اندر چلی گئیں۔ میں حیران تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ شاید اتنی کم عمری میں ایسی باتوں کا شعور نہیں ہوتا جی کو تسلی دی اور گھر چلا آیا۔ ساری رات خواب اور بیداری کی ایک عجیب سی حالت تھی جو مجھ پر طاری رہی۔ تم موٹر میں اپنی جو خوشبو چھوڑ گئیں وہ مجھے پریشان کرتی رہی اور ساتھ ہی موسیقی کی تانیں جن پر روح جھوم جھوم گئی تھی دماغ میں گونجا کیں۔

چار دن بعد جب میں دورے سے واپس آیا تو اپنی میز پر میں نے اجنبی تحریر میں جو مائل بہ پختگی تھی، ایک خط پڑا دیکھا ـــــ آج بھی معلوم نہیں پڑتا شاید میں کبھی اس گتھی کو سُلجھا نہ سکوں گا کہ میں جس نے ایسے سیکڑوں خط اپنی میز پر دیکھے تھے، جنھیں کھولا تھا اور جن کے جواب لکھے تھے، ایک خط کو پا کر کیوں ایسا بے قرار ہو گیا تھا۔ کھولنے سے پہلے میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی جیسے کوئی اَن دیکھا اَن جانا خوف ہو۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے جان پڑے۔ تم دماغ کے پردوں پر جانے کیسے آگئیں یوں جیسے غلطی سے پردہ سمیں پر کوئی غلط ریل چل جائے اور اُلٹے سیدھے عکس ظاہر ہوں اور مشین چلانے والا جی میں شرمندہ سا جلدی سے مشین بند کر دے۔ وہ لڑکی جس کو شکریہ تک ادا کرنے کا شعور نہیں بھلا وہ کیوں لکھے گی۔ مگر میں نے اُس خط کو اُسی طرح رہنے دیا اور کلکتہ سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ آدمی کئی ایسے کام کرتا ہے جس کی خود اُسے بھی سمجھ نہیں آتی۔ اس خط کو نہ کھولنے کی بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی مگر میں آنے والے لمحات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔

بغیر القاب کے بنا خطاب کے لکھا تھا۔

"تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!" شکریہ

عطیہ بیگم

"لاحول ولاقوۃ" میں نے خط کو پھاڑتے ہوئے کہا۔ کیا بے وقوف سی لڑکی ہے، بھلا یہ طریقہ شکریہ ادا کرنے کا ہے۔ اگر گھر کے دروازے پر مجھ سے کہہ دیتی تو لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر لڑکیاں اس عمر میں عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہیں۔ لڑکیاں بھی اور لڑکے بھی۔ عمر کا یہ دور جس سے اُن دنوں تم گذر رہی تھیں ایسا ہی تھا۔ شعر کے ٹکڑے کو بھی میں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کبھی کا پڑھا ہوا یہ ٹکڑا تمہارے ذہن میں ہوگا، خواہ مخواہ علمیت جتانے کے لئے تم نے لکھ دیا ہوگا۔ اپنے دل کی دھڑکن پر اور اپنی بیوقوفی پہ مجھے بہت ہنسی آئی۔ اس دن میرا موڈ بہت خوشگوار رہا۔ گھر آکر میں نے نورتی کو بہت غور سے دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری بیٹی بھی ایسی ہی حماقتیں کرتی ہو۔ کم از کم اس دن تو تمہارے ایک چھوٹے سے نوٹ کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی جواب دینا ضروری سمجھا۔ گو تمہارا پتہ اس میں لکھا ہوا صاف موجود تھا۔ بھلا میں عمر کے اس دور میں ذرا ذرا سی لڑکیوں کی حماقتوں پر غور کس طرح سے کر سکتا تھا، دنیا کے اور کام تھے۔ لکھنا پڑھنا، ملنا ملانا، بیوی بچے، میری اپنی پوسٹ، مجھے بھلا کس شے کی کمی تھی۔ کلب، دوست، احباب۔

دو دن بعد پھر ایک اسی طرح کا نوٹ میری میز پہ رکھا تھا، لکھا تھا۔

"واں وہ غرورِ عز و ناز"

میں نے جھنجھلا کر کاغذ کو سیکڑوں پرزوں میں پھاڑا اور سوچتا رہا۔ یہ لڑکی کوئی سرپھری اور دیوانی معلوم پڑتی ہے، بھلا میں اتنا مصروف انسان اس آنکھ مچولی کیلئے وقت کہاں سے لاؤں۔ اور اگر وقت مل بھی تو اس چکر میں کیوں پڑوں؟ پھر میں نے سوچا کم سن ہے اس کر نسکر... کا میں نے کوئی [illegible] کیا اس لئے اُس نے غالب کے اس مصرعے کے ذریعہ [illegible] گیا ہے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے بھلا۔ ایک کونے میں ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔

مگر میں نے دو دن اور نہ خط لکھا اور نہ فون کیا۔ عام طور پہ میں نہ ایسا سست ہوں اور نہ ہی مغرور۔ لڑکیوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کروانے کی اپنی طرف سے میں نے

بہت کم کوشش کی ہے، اگر کرو ں بھی تو دلچسپی قائم رکھنے کی خاطر گو حد سے تجاوز نہیں کرتا
مگر پھر بھی واجبی التفات کا قائل ہوں۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے تمہاری مسکراہٹ یاد آئی۔
تمہارا سراپا اور دوپٹے سے ڈھکا تمہارا سر، تمہاری جھکی ہوئی جھالر کی سی لمبی سیاہ پلکیں اور تمہارا وہ
سہما سہما سا انداز یاد آیا۔ اور پھر میں نے سوچا کہ تم ایسی بے بس جو اس رات لگ رہی تھیں اصل میں
کچھ اور ہو۔ تمہاری صورت کی بس گنی چنی لڑکیاں ہی سارے شہر میں ہو سکتی ہیں، پھر تم نے
یہ نوازش و کرم کیوں شروع کیا سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کئی بار میں نے نمبر ملایا اور پھر فوراً
ارادہ بدل دیا۔ یہ بات نہیں کہ میں تم کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتا تھا، یوں ہی جانے کیوں
جی نہیں چاہتا تھا کہ میں بات کروں، پتہ نہیں کیا تھا جو راہ میں حائل تھا۔ میں مشکل پسند بھی نہیں
ہوں اور لڑکیوں کا تعاقب کرنا میری عادت بھی نہیں پھر بھی تمہیں فون کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔
بھلا میں کیا کہوں گا، یہ کہ آپ کے دو نوٹ ملے اور میں نے جواب نہیں دیا۔ بنا گناہ کے یہ
عذر گناہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر میں نے فون نہیں کیا مگر وہ ساری شام عجیب طرح
بے کلی میں گزری۔ سونے کے لئے لیٹا ہوں تو خیال ہوا اب تو تم سو گئی ہو گی۔

دوسری صبح میں دفتر کے کاموں میں لگا تھا کہ تمہارا نوٹ پھر آیا۔ اب میں اس یک طرفہ
خط و کتابت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ زیر لب مسکراہٹ سے میں نے خط لیا، لکھا تھا۔

"قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں"

چند لمحوں تک میں سن بیٹھا رہا، اس خط میں نہ پتہ تھا اور نہ ٹیلی فون نمبر۔ پہلے والا نوٹ
میں پھاڑ چکا تھا اس لئے اب کیا ہو سکتا تھا۔ سارا دن میں بے کار ہی فون کا انتظار کرتا رہا۔
شاید تم کہیں سے فون کرو۔ پھر میں سوچتا یہ لڑکی مجھ سے محض کھیل رہی ہے۔ اگلے ایک ہفتہ
نہ تمہارا کوئی نوٹ ہی آیا اور نہ ہی فون۔ میں تمہارا فون نمبر اور پتہ یاد کرنے کی کوشش کرتا۔
مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ جھنجھلاہٹ اور عجیب بے چارگی کا احساس ہوا۔ رات کو سونے کی کوشش کرتا
تو نیند نہ آتی۔ میری ممی پوچھتیں۔ کیا ہے بے چین کیوں ہو، کیا کوئی دفتری پریشانی ہے؟"

"نہیں بھئی کوئی پریشانی نہیں"۔ میں نے قطعاً اس کی ہمدردی کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ ذرا سا غصہ مجھے آیا، اس پر نہیں اپنے آپ پر کہ ایک ذرا سی لڑکی نے جو دو دفعہ محض دل لگی کی خاطر آپ کو ذرا ذرا سے شعر لکھ دئے تو دیوانے ہونے لگے۔ اپنی چوری پکڑی گئی ہے تو شرمندگی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ فون کی گھنٹی بجی اور میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں مایوس ہو کر تمہارا وجود بھولتا جا رہا تھا تم نے فون کیا۔ مجھے خیال تک نہیں تھا کہ یہ تم ہو گی۔ میں نے ریسیور اٹھایا ہے تو تم نے کہا تھا۔

"آپ کو لکھنا نہیں آتا کیا؟" تمہاری آواز میں عجیب طرح کی ملائمیت تھی، الم سے بھری ہوئی اور رنجیدہ کرنے والی۔ میں نے کچھ لمحوں تک جواب نہیں دیا۔ میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ پھر میں نے کہا "میں مصروف ہوں بہتر ہو گا اگر آپ پندرہ منٹ بعد فون کریں"۔

وہ سارا دن فون کا انتظار کرتا رہا، دفتر میں دیر تک بیٹھا رہا یہ سوچ کر کہ شاید تم فون کرو۔ مضمحل سا اور اُداس اُداس گھر لوٹا۔ شام کو بادل تھے اور خاص چہل پہل تھی، رونق تھی اور دنیا بڑی حسین لگ رہی تھی۔ بچے مُصر ہوئے کہ انھیں سیر کرا لاؤں۔ بیوی نے کہا کہ کئی دنوں سے تم اتنے اُداس ہو رہے ہو چلو آج باہر چلیں، گھوم بھی آئیں گے اور مجھے ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے وہاں سے ہوتے ہوئے آئیں گے۔ بادلِ نخواستہ سب کو موٹر میں لاد کر چلا۔

جن صاحب کے ہاں جانا تھا وہاں کوئی پارٹی ہو رہی تھی۔ بہت لوگ جمع تھے صاحب خانہ مصروف تھیں ان کی لڑکی باہر آئی۔ تم میں اتنی ملتی ہوئی کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ جب اس نے کہا "انکل آپ نہیں اُتریں گے؟" تو میں نے ہڑبڑا کر کہہ دیا کہ نہیں میں آگے جا رہا ہوں۔ واپسی میں بچوں کو لے لوں گا۔" شام لہورنگ ہو رہی تھی، بادل چھٹ گئے تھے اور بڑے بڑے سرخ پہاڑوں کی طرح لگتے تھے، لوگ خوشیاں منا رہے تھے، موسم کی ذرا سی تبدیلی طبیعت

پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈولیوں میں بڑے جوان لڑکے گٹار بجا رہے تھے۔ موٹروں میں بھر کر سمندر کی طرف جاتے ہوئے گاتے ہوئے، عجیب ہنگامہ تھا۔" لاحول ولا قوۃ میں بھی کیا دیوانہ آدمی ہوں عطیہ بیگم کی وجہ سے کوئی شے یعنی کہ اچھی ہی نہیں لگ رہی۔ عجیب بے ہنگم خیالات ہیں ذرا سا کسی نے توجہ دی اور آپ بس گئے۔ یہی آپ کا کیریکٹر ہے جس کا ڈنکے کی چوٹ آپ اعلان کرتے ہیں۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا رہا۔

دوسرے دن رات کی سرزنش کرنے کی وجہ سے طبیعت بہت حد تک ٹھیک تھی، فون کی گھنٹی بجنے پر مجھے فون کا انتظار نہیں تھا، عام حالات میں تم سے ملنے سے پہلے میں جیسا تھا ویسا ہی تھا۔ آرام سے کام کر رہا تھا۔

چپراسی نے چک اُٹھائی اور تم اندر آئیں۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ میں نے اپنے آپ پر گرفت مضبوط کر کے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور تم بیٹھ گئیں، تمہاری مسکراتی ہوئی آنکھیں آج بھی یاد آتی ہیں تو مجھے اپنی وہ اس لمحے کی گھبراہٹ یاد آتی ہے۔ بظاہر میں کام میں مصروف تھا مگر اندر اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا تھا، آخر میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا تھا کمزور اور بے وقوف اور پاگل۔ کسی کا فون آیا جس سے مجھے خاص تقویت ہوئی میں نے سوچ لیا کہ میں تمہیں کسی ریسٹوران میں لے چلتا ہوں، چائے پلاؤں گا اور سمجھاؤں گا کہ ذرا ذرا سی لڑکیاں غالب کے اشعار کا غلط استعمال نہیں کیا کرتیں۔ عجیب سرپرستانہ انداز سے میں نے کہا۔ "چلو بی بی تم کو کسی کیفے میں چائے پلائیں۔" اور یہی میری غلطی تھی۔ اگر اس گھڑی تم سے دفتر میں بات کر کے تم کو رخصت کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ چپراسی سے میں نے کہا۔ "کام سے جا رہا ہوں آدھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔" بیٹھتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ تمہارے لئے کھول دیا اور خود ڈرائیو پر جا بیٹھا۔ موٹر چلی ہے تو تم نے کہا۔

"کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا۔"

میں اس قدر تیزی سے کسی تقریر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، میں ناصح نہیں ہوں مگر پھر بھی میں نے کہا۔

"لگتا ہے غالب کے اشعار آپ کو خوب یاد ہیں۔"

تم نے موٹر چلاتے ہوئے میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا اور کہا۔

"آپ مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں، میں اٹھارہ سال کی کب سے ہو چکی ہوں اور بی اے میں پڑھتی ہوں، آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے کہ میرے خطوں کے جواب نہیں دیتے، مجھ سے فون پر بات نہیں کرتے، آپ کون ہوتے ہیں اس طرح میری بے عزتی کرنے والے؟"

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور بظاہر تم سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے کہا تھا۔

"بی بی تم میری بیٹیوں کے برابر ہو اور پھر خطوں میں ایسی کون سی بات تھی جس کا جواب میں ضرور دیتا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو قطعاً نہیں جانتا میں فون پر آپ سے کیا کہتا۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ کو دلوں میرے فون کا انتظار رہا ہو گا اور خط کا بھی۔ میں آپ کی بیٹیوں کے برابر ضرور ہوں مگر آپ کی بیٹی نہیں۔ آپ مجھ سے یہ بزرگانہ مشفقانہ برتاؤ نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ آج میں شکست دینے یا ہار ماننے آئی ہوں۔ اور میں آپ کے ساتھ کسی ریسٹوران میں نہیں جا رہی، مجھے کلفٹن یا کسی اور جگہ لے چلئے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے سمجھے آپ۔"

میں نے موٹر کلفٹن کی طرف موڑ لی۔

سارا راستہ تم نے کوئی بات نہیں کی، تمہارے سانس لینے سے پتہ چلتا تھا کہ تم ہانپ رہی ہو جیسے بہت دور کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ میں پنجرے میں بند پرندے کی طرح محسوس کر رہا تھا جیسے بھاگ بھاگ کر تھک کر کوئی صیاد کے آگے اپنے آپ کو بے بس پائے۔ میں نے جی میں کہا کیا زوردار لڑکی ہے اور کس قدر جرات مند۔ میں تمہاری ہمت کی تعریف کئے بغیر

نہیں رہ سکا۔

ہم سمندر کے کنارے تک ایک دوسرے سے کچھ کہے بنا چلتے گئے جیسے تمہیں مجھ سے کچھ نہ کہنا ہو۔

میں نے کہا۔ "عطیہ بیگم میرا خیال ہے یہی آپ کا نام ہے، کہئے آپ کو مجھ سے کیا کہنا ہے؟"

تم پھر بھی چپ رہیں۔

میں نے کہا "بھائی آخر کب تک سمندر کے کنارے ٹہلیں گے۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کو مجھ سے بہت کچھ کہنا ہے، بولئے تو سہی"۔

تم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں"

میں نے کہا "عطیہ بی بی آپ میرے لئے بالکل اجنبی ہیں، میں بال بچوں والا آدمی ہوں، آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں بتا دیں تو مہربانی ہوگی"۔

تھوڑی دور تک اور ہم ایسے ہی چلتے گئے، میں حیران تھا کہ اب جانے آگے یہ لڑکی کیا کرے مگر تم نے پلٹ کر اپنے بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دئے اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر رونے لگیں۔ تمہاری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے آپ چھڑا نہیں سکتا تھا اور میں نے نہایت آہستگی سے تم کو اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش بھی کی مگر تم اور مضبوطی سے اپنی باہوں کا حلقہ میرے گرد تنگ کرتی گئیں۔ میں نے تمہارے سر پہ ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی تو تم نے اس طرح سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں اٹھارہ سال کی جوان عورت ہوں بچہ نہیں، میرے سر پہ ہاتھ مت پھیریں"۔

بخدا زندگی میں اس گھڑی سے زیادہ میں نے کبھی اپنے آپ کو خالی الذہن نہیں پایا۔ میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، میں جو ایک ذمہ دار شہری،

ذمہ دار افسر اور ذمہ دار باپ تھا جس کی بیوی کی شوہر پرستی مشہور تھی اور جس کی آنکھ مچولی بھی اس قدر بے ضرر ہوتی تھی کہ قصے نہیں بن سکتے تھے۔

میں نے دیکھا دور دور تک ساحل پر کسی آدمی کا پتہ نہیں تھا، ہو سکتا ہے شرم کے مارے میرا بُرا حال ہو جاتا۔ میں نے کہا نا کہ تم میری زندگی میں پہلی لڑکی نہیں تھیں مگر پھر بھی تمہاری نسائیت کہاں گئی تھی اور میں کس طرح سے گرفتار تھا۔

تمہارے اور میرے قدموں کے نشانات پر جانے کتنے لوگ انہی راہوں پر چلے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے میں ہی پہلا آدمی تھا جو اس طرح سے پکڑا گیا۔

تمہاری سب حرکات میں، نہ تو بناوٹ تھی اور نہ ہی وہ سادگی جو پاگل پن کہلاتی ہے۔ پھر میرے سینے سے لگی لگی تم مسکرائیں، تمہاری آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ جس میں نہ ریا تھی اور نہ شوخی سیدھی سادہ سی ایک بے بس لڑکی کی بے چارگی کی الم زدہ ہنسی اور یہی تمہاری الم زدہ ہنسی تھی جس نے مجھے جیت لیا۔

اس شام میں گھر آیا ہوں تو بیوی نے کہا "آج تم کہاں تھے، بچے کو چوٹ آئی تھی میں نے بار بار دفتر فون کیا، پتہ چلا تم آدھ گھنٹے کا نوٹس دے کر چلے گئے ہو اور لوٹ کر نہیں آئے۔ میں حیران تھی کہ تمہیں کہاں تلاش کیا جائے۔"

"یوں ہی ایک پرانے دوست مل گئے، اُن سے باتیں کرتے رہے پرانے دنوں کی باتیں دل کو عجیب طرح اپنے شکنجے میں لیتی ہیں۔" مگر میں نے آنکھ اُٹھا کر بیوی کی طرف نہیں دیکھا۔ سونے کے لئے لیٹا ہوں تو جی چاہتا چپ نہ ہوں کسی سے باتیں کئے چلا جاؤں۔ مگر احساسِ گناہ بھی کہیں دور دل کے گوشے میں تھا، بھلا بچے کو چوٹ آئی ہوئی ہو اور میں کیسا باپ تھا جو ساحل سمندر پر بیٹھا تھا؟

کچھ دنوں پھر نہ تمہارا فون آیا اور نہ ہی کوئی خط۔ میں مضطرب بے چین تمہاری خوشبو کو اپنے سینے میں امانت کے بوجھ کی طرح چھپائے اپنے کاموں میں لگ گیا۔ تم سے

ملنے کا طریقہ کوئی نہیں تھا اور تم سے بات کہیں ہو نہیں سکتی تھی۔ تم جانے کون مخلوق تھیں کہ غائب ہوگئیں تھیں۔

پندرہ دن، اضطراب اُمید و بیم کے پندرہ دن، تمہاری کسی خبر کے بنا پندرہ دن گزر گئے تو تمہارا فون آیا۔

"میرا ایک کزن آیا ہوا ہے اس کی وجہ سے نہ آنا ہو سکا ہے اور نہ ہی فون۔"

میں نے شکایتاً کہا۔ "کم از کم تم فون تو کر سکتی تھیں۔"

اور تم نے کہا تھا۔ "انتظار کا المیہ یہ ہے کہ وہ سب کو یونہی پریشان کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ سے ملنے آؤں اور کزن کو بھی ساتھ لاؤں۔ خیر میں آؤں گی۔"

اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

میں ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا ہوا ایک ایسے اُلّو کی طرح لگ رہا تھا جس پر ساری دنیا ہنستی ہو۔ مجھے خود اپنے اوپر رحم آیا۔ ان پندرہ دنوں کی پندرہ بے آرام راتوں میں مجھ پہ کیا کچھ نہیں بیتا تھا، میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میرے عزم میرے ارادے ایک اٹھارہ سال کی نوخیز لڑکی کے ہاتھوں برباد ہو گئے۔ اس کا وجود میرے اخلاقی نظریوں اور خودداری کا مذاق اڑا رہا تھا۔ میں ایک زرخرید غلام کی طرح اس کے فون اور اس کی آواز کے ترنم کو سننے کے لئے ترستا تھا۔ وہ چھلاوے کی طرح جب چاہتی تھی غائب ہو جاتی تھی اور جب چاہتی تھی دکھائی دیتی تھی۔ مثنویوں کے شہزادوں کی طرح میں بھٹک رہا تھا اور وہ غصّہ ور جادوگرنی جب جی چاہتا تھا مجھے جدائی کے کنوئیں سے باہر نکالتی، کھلاتی پلاتی اور پھر مجھے اسی کنوئیں میں پھینک دیتی تھی۔

جس دن تم کزن کو لے کر آنے والی تھیں میں صبح سے دوپہر تک دفتر میں ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ جب چک اُٹھتی اور چپراسی آتا میں سوچتا یہ تم ہو۔ پھر تمہارا فون آیا کہ تم کالج میں ہو، کسی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ اگر میں اسکول تو تمہیں

وہاں سے لے لوں۔ جُز بُز تو میں ہوا مگر چونکہ تم فون بند کر چکی تھیں اس لئے کالج کی طرف چلا۔ تم آئیں بال بکھرے ہوئے ایک المیہ کردار کی صورت اور آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئیں، تمہاری پلکوں کے نیچے سے مُسکراہٹ تمہارے رُخساروں پر پھیل رہی تھی، تمہارے لمبے سیاہ بال لبادے کی طرح تمہارے گرد پھیلے تھے۔ تم نے نہایت خوب صورت رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا، اُس کا عکس تمہارے چہرے کو بھی رنگے دیتا تھا، جیسے یہ تم نہیں ہو زہر کا رنگ ہو سبز رنگ، مجھے لگا جیسے تم نے زہر پی رکھا ہے اور اب کوئی دم میں گرنے والی ہو پھر ہولے ہولے یہ زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

تم نے اتنے دنوں کی غیر حاضری کی معذرت نہیں کی، کچھ نہیں کہا میرے سینے پر سر رکھے سِسکتی رہیں۔ میرا نام لے کر پکارتیں اور میرے سینے سے لگ جاتیں جیسے یہ بھی تمہارے ہاں ہونے والے ڈرامے کا ایک حصہ ہو اور میں بھی اُس ڈرامے میں کوئی کردار ہوں نہایت غیر اہم سا۔ اصل میں مجھے معلوم نہیں عطیہ بیگم کہ تمہارے اس ڈرامے میں جس کو میں تمہاری ذات کا المیہ کہوں گا میں نے کون سا کردار ادا کیا۔ بیتے وقتوں کے بائیسکوپ میں کردار صرف حرکتوں سے اپنا آپ واضح کرتے تھے مگر میری سب حرکتوں پر تو تمہارا اختیار تھا صرف تمہارا اور اب میں تمہارے چپ چاپ اندھیرے میں سے آنے اور اپنے ساتھ لگ کر روتے رہنے کا عادی ہو چلا تھا۔ خالی الذہن میں اگر چاہتا کہ اپنے آپ تمہارے سر پر ہاتھ پھیروں، تمہارے بالوں کی خوشبو سونگھوں، تمہاری بھی میں جلتا، آنچ دیتا جسم چھولوں تو یہ ناممکن تھا یہی معمول تھا اور تم عامل تھیں۔ جب تم مجھے چھوڑ دیتیں تو میں تمہارا ہاتھ تھام لیتا۔ ہم سامنے سمندر کو دیکھتے رہتے۔ میں بات کرتا تو تم میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتیں اور میں خاموش گم سم اُسی طرح بیٹھا رہتا۔ آج جب تمہیں دیکھے اور تم سے ملے زمانے ہو گئے ہیں اور میں تمہاری طرف سے کچھ مایوس بھی ہو چلا ہوں۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ تم کیا ہو۔ تمہاری ملاقاتوں میں اتنا

موقع ہی کب ملتا تھا کہ تم سے کچھ پوچھا جاتا۔

تمہارے کالج کا ڈرامہ ہم بھی دیکھنے گئے تھے۔ اصل میں میرے دوست مجھے کھینچ کر لے گئے، میں جانا نہیں چاہتا تھا، مگر چلا گیا۔ جب جب تم اسٹیج پہ آتیں ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھتا۔ لوگ کس اشتیاق سے تمہیں دیکھتے تھے۔ میرے دوست نے کہا۔

"ریاض یار دیکھو یہ کیسی لڑکی ہے، اس کردار کے لئے کتنی موزوں ہے۔ تم اگر یہ جانتے کہ وہ کون ہے تو اس ڈرامے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔"

میں نے کہا "تم اسے جانتے ہو کیا؟"

میری آواز کا اضطراب محسوس کر کے میرے دوست نے سر ہلا دیا مگر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس بے چینی کی تھاہ لینا چاہتا ہو۔

میں شرمندہ سا ہو کر پھر اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ عطیہ بیگم میرے دل میں شک نے سر اٹھایا۔

اس دن میں نے خاص طور پہ بہت دن پہلے سے کسی غیر ملک میں جانے والے دوست سے باکس بے پہ اس کے ہٹ کی چابی مانگ لی تھی۔ میں کئی دنوں سے تمہارا منتظر تھا۔ تم نے جلدی میں گھبراہٹ میں ویسے ہی فون کیا کہ تم آنے والی ہو اور مجھے دفتر میں نہیں ملو گی بلکہ کسی بس اسٹاپ سے میں تمہیں لے لوں۔ وہ اسٹاپ میری راہ سے بہت دور تھا میں نے وہاں کے کئی چکر لگائے مگر تم نظر نہیں آئیں۔ جب میں مایوس ہو کر جانے والا تھا اور لوگ مجھے یوں موٹر میں گھڑی گھڑی اس جگہ کے چکر لگاتے دیکھ کر شک و شبہ سے دیکھ رہے تھے، تم آئیں جیسے دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو اور دروازہ کھول کر میرے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ موٹر میں بیٹھتے ہی میں نے پوچھا۔

"عطیہ بیگم میرے علاوہ اور کتنے لوگ آپ کو جانتے ہیں؟"

"آپ کے علاوہ بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں، مگر یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں۔

کیا آپ کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

میں نے سوال جس طرح سے میں چاہتا تھا تم سے نہیں پوچھا تھا اور پھر ہاکس بے کے اُس ہٹ میں شام ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی ہمیں بہت طویل مسافت طے کرنا تھی اور میں بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

ہاکس بے پر پہنچتے ہی تم نے کہا "بس ذرا سمندر کے کنارے ٹہلیں گے پھر میں گھر جاؤں گی۔ میری امّی کا جی اچھا نہیں ہے"۔ ہوا زوروں میں چل رہی تھی، بادلوں کی سیاہی میں سمندر ملگجے پانی کا اُبلتا ہوا کنواں تھا۔ ہم دیر تک کنارے کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتے رہے، ہاتھ میں ہاتھ دئے۔ بیچ بیچ میں تم میرا ہاتھ پکڑ کر دباتیں۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے بازو میں جکڑ لیتیں اور میرے سینے پر سر رکھ دیتیں۔ اور ہر دفعہ مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ تمہاری گرفت آج کی طرح اُس وقت مجھ پر اتنی گہری ہوتی اور میں سوچتا تھا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تمہیں کتنے لوگ جانتے ہیں۔ اس ایک لمحے تو تم صرف میری ہو۔ تمہارا وجود اس روز لہروں کے شور اور ہوا کی تندی میں مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ لگا اور پھر اب کہ میرے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی تم مجھے ایسے سچے گلاب کی طرح لگیں جو میرے ذرا سا چھونے اور ہاتھ لگانے سے اپنا رنگ اور خوشبو کھو دے گا۔ تمہاری محبت نے میری زندگی کو نئی جلا اور میرے جینے کو نئی اُمنگ بخشی تھی، تمہارے گلابوں کا اثر مجھ پر ہو رہا تھا۔ میں اُن دنوں خوشی اور سرشاری کی نئی لذّت کے ساتھ ساتھ تلخی اور بے بسی کے نئے دوراہے پر تھا۔ تم ہوا کی طرح میرے آس پاس اردگرد میرے وجود کا احاطہ کئے تھیں اور میری پہنچ سے باہر بھی۔

جب میں نے واپس جانے کے لئے موٹر کا دروازہ کھولا ہے تو تمہارا اپنی امّی کے جی کے لئے سارا اضطراب رُخصت ہو گیا، تم اسی طرح میرے ساتھ لگ کر

کھڑی ہوگئیں۔ اگر میں چاہتا تو ہم ہاکس بے کی اُس ہٹ میں رات سمندر کے کنارے گذار سکتے تھے مگر میں نے بہت دلوں سے پہلی گھڑی سے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا تھا مجھے آج بھی معلوم ہے اگر میں تمہیں آسرا دیتا تو تم اس ہٹ تک پہنچ سکتیں مگر میں تمہاری نگاہوں کے عزم سے آج اپنے آپ کو بچانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری خودسپردگی میرے اشارے کی منتظر ہے مگر میں تمہیں تمہارے سپرد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں تمہیں واپس لے آیا۔

واپسی میں تم باتیں کرتی رہیں جیسے میری بیاہتا بیوی میرے ساتھ کرتی تھی۔ سیاست کی، دنیا کی، موسم کی۔ چند لمحوں پہلے کی ساحل سمندر کی۔ عطیہ میں اور تم میں کتنا فرق تھا۔ جب میں تمہیں تمہارے گھر کے سامنے پہنچا کر واپس آرہا تھا تو تم نے ایسی زخمی نظروں سے مجھے دیکھا مانو میں نے تمہیں بہت ہی ٹھیس پہنچائی ہو، تمہاری بے عزتی کی ہو۔

اس کے بعد بہت دلوں تمہارا فون نہیں آیا۔ میں نے تمہارے گھر کے کئی چکر لگائے یونہی سامنے سے گذرا چلا جاتا ایک بار تم دکھائی دیں پائنچے اٹھائے ٹیوب لئے اس انہماک سے پھولوں کو پانی دیتی ہوئیں کہ میں نے سوچا یہ تم نہیں ہو کوئی اور ہے مگر تم نے آنکھ اُٹھا کر باہر کی طرف نہیں دیکھا۔ بس ایک جھلک اور کچھ نہیں۔ امتحانوں کا زمانہ بیت گیا۔ میں نے تمہارے کالج کی لڑکیوں کو یوں گھور گھور کر دیکھا کہ شاید تمہیں دیکھ سکوں مگر مہینوں گزر گئے اور تم نہیں آئیں۔ میرے جذبات کی پُر شور ندی میں وقت نے نرم روی پیدا کر دی، جانے کتنے موسم بیت گئے۔ ہاں عطیہ بیگم کتنے ہی موسم بیت گئے دل کی دنیا میں موسم روز تو نہیں بدلتے اور تمہارے لئے میرے جذبات میں جو ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے وہ زمانوں کے گزرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ بہت دور چلا ہوں، اتنی دور تک کہ میرے پاؤں میں اب اور آگے جانے کی سکت نہیں ہے۔ مگر تم نے مجھے آگے چلایا ہی کہاں ہے۔ جب تم سے ملاقات ہوئی ہے تو تم زرد رُو

اور دھلی ہو رہی تھیں، تمہاری آنکھوں میں گھائل ہرنی کی سی اَلم ناک بے بسی تھی اور وہ مُسکراہٹ جس نے میرا سب کچھ ہر لیا تھا۔ تم نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے کوئی اطلاع آنے کی نہیں دی تھی، صرف ایک نوٹ لکھا تھا۔

"داغِ فراق وصحبت شب کی جلی ہوئی"

میرا دل اس کو دیکھ کر دھڑکا نہیں، میں نے سارے خطوں سے الگ اُسے اپنے سامنے رکھ لیا اور بہت دیر اُسے پڑھتا رہا یہاں تک کہ حروف میری آنکھوں میں دھبّوں کی طرح اُبھرنے لگے، مجھے اپنے چہرے پر نمی محسوس ہوئی، کیا میں رو رہا تھا؟ تمہارے فراق کی مدّت اتنی طویل اور تمہارے وصل کی گھڑی اتنی مختصر ہوا کرتی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ کیا میں تمہارے لئے پریشان تھا؟

دفتر کے سامنے نکلتے ہی تم مجھے مل گئیں۔ بیٹھتے ہی تم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں بھیڑ میں موٹر چلاتا رہا اور تم اپنے سامنے دیکھتی ہوئی چُپ چاپ آنسو بہاتی رہیں۔ تم نے میرے سینے پر اتنے آنسو بہائے ہیں مگر وہ کیف ونشاط کے آنسو تھے، دو گھڑی مل بیٹھنے کی خوشی کے آنسو، جانے کیوں مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا لگا۔ ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ ہاکس بے ہم سے بہت پیچھے رہ گیا اور سامنے گہرا نیلا بے پایاں بے کراں سمندر کروٹیں لے رہا تھا لہریں غصّہ ور دیو کی طرح پھنکار رہی تھیں۔ اگلی ملاقاتوں کی طرح تم نے اپنا سر میرے سینے سے نہیں لگایا آج شاید تم نے کچھ بھی نہ کہنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی۔ (اور میں) ایک پتّھر پر بیٹھ گیا۔ تمہارے قرب سے سرشار، آخر میرا کیا حق تھا تم پر۔ تمہارا وجود مجھے خوشی دیتا تھا میرے لئے یہی کافی تھا۔ میں نے تم سے اس طویل خاموشی کی وجہ نہیں پوچھی۔ میں نے اتنے دنوں میں قدرت کی طرح تمہارے بدلتے رنگوں سے مطابقت پیدا کر لی تھی اور مجھے نہ تمہاری محبت پر یقین تھا اور نہ ہی بے یقینی۔ تم نے

پلٹ کر مجھ سے کہا تھا "دنیا میں ہاکس بے کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں، سمندر سے مجھے اب خوف آنے لگا ہے، کیا ہم اور کہیں نہیں جا سکتے۔ مجھے اس شہر کی نگاہیں پیس کر رکھ دیں گی۔ میں یہاں ایک لمحہ نہیں رُکنا چاہتی۔"

"یہ تم میں خود کلامی کی عادت کب سے پیدا ہو گئی، تم تو بات کرنے کو وقت کی توہین خیال کرتی ہو۔" میں نے پتھر سے اُٹھ کر تمہاری طرف آتے ہوئے کہا۔

تم میری ٹانگوں میں لپٹ گئیں، تمہارے بازوؤں کے حلقے میں میں کانپ گیا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو کہیں دُور، جہاں یہ جان کو پینے والا موسم نہ ہو۔ یہ سمندر کی نمی سے بھری ہوا نہ ہو، یہ جادو جگاتی ہوئی لہریں نہ ہوں، تم مجھ پر اتنا احسان نہیں کر سکتے۔"

"مگر کیوں عطیہ بیگم۔" میں نے بہت ہمت سے کام لے کر کہا۔ "سمندر کو شروع سے تم نے منتخب کیا ہے اور میں سوچتا ہوں یہ ٹھیک ہی ہے۔"

"تم سوچتے ہو! تم سوچتے ہو! تم کچھ نہیں سوچ سکتے۔ تم نے سوچا ایک جوان عورت تمہاری جھولی میں آ گری ہے، تم نے کبھی مجھ سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر نہیں کیا، میں آؤں یا نہ آؤں تمہیں اس سے کیا۔ تمہیں میرا وجود پتھر کے ٹکڑے کی طرح لگتا ہے، غیر اہم اور لایعنی بیکار، سچ کہنا میری غالب پسندی تم کو کھیل نہیں لگتی، تم کو کیا پتہ خون جگر ہونے تک آدمی پر کیا بیت جاتی ہے۔"

تم بیٹھے سے کھڑی ہو گئیں۔

"میں نے تو ایسا تم کو ستانے کا کوئی کام نہیں کیا عطیہ بیگم۔ میں تو چراغ کا جن ہوں جب جب تم نے مجھے پکارا ہے تمہاری آواز پر لبیک کہا ہے۔ یہ تمہاری مجھ سے غالباً چوتھی ملاقات ہے اور خود میں بھی سوچتا ہوں کہ یہ حالت زیادہ دنوں نہیں چل سکتی۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو مجھے بتا دو تو شاید راہ آسان اور زندگی میں کچھ سکون ہو۔ اور اب حالت یہ ہے کہ تم میری اور اپنی دونوں کی مالک و مختار ہو۔"

اور عطیہ تم نے کہا تھا۔ "یہ راہ ہم دونوں نے چُنی ہے تم کو مجھ سے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

ہم برسوں سے ساتھ رہنے والے دوستوں کی طرح ایک دوسرے پر الزام دھر رہے تھے۔ عطیہ تم اٹھارہ سال کی جوان عورت تھیں اور میں تمہارے قدموں کے نشانوں پر کتنی دور نکل آیا تھا۔ یہ تمہارے قدموں کے نشان ہی تھے ورنہ تم میری منزل نہ تھیں میں تمہارا سہارا نہ تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "میں شکایت نہیں کر رہا میں صرف اس صورتِ حال کی بات کرتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم نے کہا تھا "مجھے سہارے کی ضرورت تھی اور تم میرا سہارا بننا نہیں چاہتے تم کو مجھ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے۔ میں نے تمہیں دل و جان سے چاہا ہے تم مجھے نہیں چاہ سکے یہ میری بدقسمتی ہے اور میں کیا کہوں؟"

پھر تم مجھ سے مُنہ موڑ کر موٹر میں جا بیٹھیں اور میں تمہیں واپس لے آیا عطیہ بیگم، میں آج اس اکیلی رات میں جب نہ کہکشاں ہے اور نہ تارے اقرار کرتا ہوں عطیہ بیگم کہ میں نے تمہیں چاہا تھا اور میرا دل تمہیں دیکھ دیکھ کر بہت جلا ہے جب مجھ سے روٹھ جانے کے بعد بظاہر تم کبھی مجھ سے نہیں ملیں مگر اکثر تم دوسروں کے پہلوؤں میں اوروں کی موٹروں میں غیروں کے ساتھ مجھے دکھائی دی ہو۔

جانے تم نے مجھ سے کیا چاہا تھا؟

مگر عطیہ میں تمہاری ہمت کی وجہ سے تمہاری عزت کرتا ہوں اور تمہاری جرأت نے کبھی مجھے آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ نہیں دیا۔ میں نے سدا تم سے تمہیں بچانا چاہا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے بھی تمہیں بچایا ہے تم میری امانت ہو عطیہ جو میں نے دنیا کو سونپی ہے۔

تم کو کیا معلوم میں نے ان گھڑیوں کو جب تم میرے سینے سے لگ کر سسکتی تھیں کیسا سنبھال کر رکھا ہے، اس الوہیت کو میں برباد نہیں کر سکتا تھا، ان لمحوں کی قیمت نہ تم ہو اور نہ میں۔ ہو سکتا ہے ہم کچھ دور ساتھ چلتے میرا مطلب ہے کچھ دور اور میں تمہارے قدموں کے نشانوں پر چلتا مگر چاہتیں منزل نہیں بن سکتیں عطیہ بیگم۔ یہ تو زندگی کی راہ پر چلنے والے دئے ہیں جن کی روشنی میں راہ طے ہوتی ہے بھلا میں اس یخ بستہ بے رحم دنیا میں تمہارے وجود کی روشنی میں کتنی دور چل سکتا تھا؟ اور کون جانتا ہے اس کی منزل کہاں ہے؟

مگر جب بھی نامعلوم خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی ہیں میں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے یاد آتی ہو عطیہ بیگم، گھاس میں سے جھانکتے ہوئے اکیلے پھول کی طرح مغرب کے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے کی طرح۔

سُہیل عظیم آبادی

دل کا کانٹا

"تمھارا نام کیا ہے ؟"

"سجنی۔"

جب اُس نے چائے کی ٹرے لاکر مسہری کے پاس چھوٹی سی میز پر رکھی اور پیالی میں چائے ڈالنا چاہتی تھی تو انل نے پوچھا۔ اور سجنی نے آہستہ سے جواب دیا۔ نام سن کر انل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انل کو مسکراتے دیکھ کر سجنی جھینپ گئی اور بولی۔

"میرا اصل نام سروجنی ہے۔ مگر ماں کو کہنا نہیں آتا۔ اور اب یہی نام پڑگیا"۔ صفائی دینے کے بعد بھی سروجنی کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی۔ انل مسکراتا ہوا بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ لوگ نام بگاڑ دیتے ہیں۔ مگر تمھارا نام تو بگڑ کر اور بھی اچھا ہوگیا ہے"۔

سجنی کا چہرہ لال ہوگیا۔ اُس نے جلدی سے آنچل کا کونا ہونٹوں میں دبالیا۔ اور جلدی سے چائے پیالی میں ڈال کر اُس کی طرف بڑھادی۔ انل نے ایک گھونٹ چائے پی اور بولا۔

"چائے تو بہت اچھی بنائی ہے تم نے"۔

سجنی نے کنکھیوں سے امل کو دیکھا اور جلدی سے نگاہیں نیچی کرلیں۔ مگر امل نے دیکھ لیا وہ اور جھینپ گئی اور بولی "اسکول میں مدرہم لوگوں کو ہر کام سکھاتی تھی۔"

امل کچھ اور بولنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی اور جب وہ چائے کی دوسری پیالی بھی پی چکا اور سجنی ٹرے اُٹھاکر جانے لگی تو امل بولا۔

"کھانا مزے دار پکانا۔"

سجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ چلی گئی۔ امل کو محسوس ہوا کہ اُس نے بے ڈھنگی سی بات کہہ دی اور سوچنے لگا کہ کہیں بُرا نہ مان جائے۔ نہ جانے سجنی اُس کے بارے میں کیا سوچے۔ بیوقوف سمجھے یا بُرا آدمی۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ کچھ ہی دن پہلے اُس نے ایک ناول میں پڑھا تھا کہ کوئی جوان لڑکی کسی جوان لڑکے کے کچھ کہنے کا بُرا نہیں مانتی، بلکہ چاہتی ہے کہ وہ کچھ کہے۔ اچھی بات جس سے خوشی ہو یا ایسی بات جس سے دل کو ٹھیس لگے۔ کوئی ایسی بات جس سے اس کا دل کروٹ لے، بلکہ ایسے نوجوانوں کو لڑکیاں بیوقوف سمجھتی ہیں جو نہ اُن سے بولیں نہ ہنسیں اور نہ اُنھیں چھیڑیں۔ اور ایسے بیوقوفوں سے وہ بہت جلد اُکتا جاتی ہیں۔ جوان لڑکیاں ایسے جوانوں کو پسند کرتی ہیں جو اُنھیں ہنسادیں یا رُلادیں۔ اور اُسے اطمینان ہوگیا۔ سجنی نے ہرگز کوئی بُرا اثر نہیں لیا ہوگا۔ اور وہ تو کچھ پڑھی لکھی بھی ہے۔ اس نے سوچا اچھا ہے جب تک مہنگو بیمار رہے گا سجنی رہے گی اور وقت ذرا اچھا کٹے گا۔

سجنی سمجھدار بھی تھی اور صورت شکل بھی اچھی تھی۔ یکایک اُسے مہنگو کی بات یاد آئی اور اُس کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ مہنگو نے ٹھیک ہی کہا تھا سجنی بڑی بدنصیب لڑکی ہے۔ اگر بدنصیب نہ ہوتی تو بلرام ماسٹر کے گھر کیوں پیدا ہوتی۔ کسی راجہ مہاراجہ کے گھر پیدا ہوتی اور رانی بن کر راج کرتی۔ دس روپے مہینے پر کھانا پکانے اور خدمت کرنے کیوں آتی۔ اور وہ بھی چند دنوں کے لئے۔ جب مہنگو اچھا ہوجائے گا تو اس کی نوکری ختم

ہو جائے گی۔ پھر وہ چپ چاپ اپنے گھر کے دھندے میں لگ جائے گی۔ اسکی بھاوج روز اُس سے لڑے گی کہ میٹھی بیٹھی کھاتی ہے، ماں دن بھر اُس سے چڑچڑ کرے گی اور رات کو بلرام ماسٹر جب خوب پی کر آئے گا تو اپنا سارا غصّہ سجنی پر نکالے گا۔ مہنگو نے امل سے بلرام ماسٹر اور سجنی کی ہر بات کہہ دی تھی اور امل کو اس سے ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ سجنی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر ایک کتاب لے کر مسہری پر لیٹ گیا اور پڑھنے لگا۔

امل خود بڑے جذباتی دور سے گزر رہا تھا۔ اس کے بیاہ کی بات طے ہو گئی تھی لیکن برات سے تین چار دن پہلے اسے بخار آ گیا اور ڈاکٹروں نے اُسے ٹائیفائڈ بتایا۔ بیاہ رُک گیا۔ بخار مہینے بھر چلتا رہا، جب اچھا ہوا تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ ہوا پانی بدلنے کو رانچی یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ اور وہ رانچی چلا آیا تھا۔ رانچی میں شہر سے باہر اُس کا اپنا مکان تھا اور اچھی آب و ہوا میں اس کی صحت جلد ہی سُدھر گئی۔ لیکن بیاہ کی تاریخ ٹل گئی تھی۔ اُسی دوران میں کسی نے مشہور کر دیا تھا کہ امل کو ٹی، بی کا بھی اثر ہے۔ اور اس کے ہونے والے سسر پربھات بابو نے کہلا بھیجا تھا کہ جب تک وہ اپنے بھروسے کے ڈاکٹر سے امل کو دکھا نہ لیں گے، بیاہ کی تاریخ مقرر نہیں کریں گے۔ اور اگر ڈاکٹروں نے ذرا بھی شک ظاہر کیا تو بات ختم سمجھی جائے۔ یہ بڑا جذباتی جھٹکا تھا جو امل کو لگا تھا اور اُس نے اچھا ہونے کے بعد اپنے لوگوں کو لکھا تھا کہ وہ جلد کلکتہ جانا نہیں چاہتا۔ وہاں بھی کوئی خاص کام نہیں، لکھنا ہی پڑھنا ہے، تو وہ رانچی میں ہی رہے گا۔ اور کچھ دن اور بھی آرام کرے گا۔ بیاہ ٹل ہی چکا تھا اب جلدی کس بات کی تھی۔

پربھات بابو بیرسٹر تھے۔ اور مزاج کے لحاظ سے بالکل انگریز تھے۔ بہتوں نے اُنھیں سمجھایا اور کہا کہ امل بالکل اچھا ہے کوئی بات نہیں مگر وہ اپنی ضد پر اَڑے ہوئے

تھے کسی بیمار آدمی سے آخر بیٹی کا بیاہ کیسے کر دیتے۔ حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن کی بیٹی کو اس کا خیال نہ تھا۔ اگر انل کو سچ مچ بھی ٹی بی ہوتی تو نرملا اس سے بیاہ کر کے خوش رہتی۔ مگر پربھات بابو کو کون سمجھاتا۔ اور پربھات بابو کی اس اینٹھن کا اثر انل کے باپ سرت بابو پر خراب پڑا تھا۔ اور وہ کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر پربھات بابو نے سمجھا کیا تھا۔ اگر وہ نہیں کرینگے تو کیا انل کا بیاہ نہیں ہوگا۔ انل اور نرملا کی زندگی مصیبت میں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھ رہے تھے، اور اپنے طور پر ایک دوسرے کو یقین دلا رہے تھے کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر وہ کسی دوسرے سے بیاہ نہیں کر سکتے اور چاہے کتنے ہی دن لگ جائیں لیکن ایک نہ ایک دن مل کر رہیں گے۔

مگر پھر بھی انل پر اس کا اثر بہت خراب ہوا تھا۔ خیال کی دنیا میں اُس نے جو محل بنائے تھے وہ زمین پر آگرے تھے۔ اُس کی بھاوج نے بہت سے خط لکھے اور طرح طرح سے سمجھایا اور کلکتہ بلایا۔ لیکن انل نے برابر اُسے لکھا کہ اُسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اگر اُسے تنگ کیا جائے گا تو کہیں اور چلا جائے گا۔ اُس کی بھاوج جانتی تھی کہ انل کو نرملا کتنی پسند ہے۔ بیاہ کی بات چلانے میں خود اسی نے مدد کی تھی۔ نرملا اس کی پھوپھی کی بیٹی تھی اور دو چار بار اس سے ملنے آئی تھی تو انل نے نرملا کو دیکھا تھا۔ اور اُسے ایسی پسند آئی تھی کہ پھر وہ کسی دوسری لڑکی کا خیال تک دل میں نہ لایا۔

رانچی میں انل کے باپ سرت بابو نے شہر سے باہر خوب صورت بنگلہ بنایا تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی دیوار تھی، باغ تھا۔ خوبصورت پھلواری تھی، اور آس پاس کوئی دوسرا مکان نہ تھا۔ پچھواڑے میں بلرام ماسٹر کا چھوٹا سا کچّا مکان تھا اور تھوڑی سی زمین تھی، جس میں بلرام ماسٹر ترکاری کی کھیتی کرتا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے زمین کوڑنے اور پانی پٹانے کا کام کرتا تھا۔ بڑا بیٹا فوج میں بھرتی ہو کر

نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہا تھا اور چھوٹا بیٹا ایک ٹھیکہ دار کے یہاں کام کرتا تھا۔ سجنی بڑی بیٹی تھی اور روپا سب سے چھوٹی۔

امل تو کسی کو جانتا بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی سب کو آتے جاتے دور سے اُس نے دیکھا ضرور تھا۔ اُن سب کے بارے میں اُسے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ مہنگو سے۔ مہنگو کو گپ مارنے کی بیماری تھی۔ جب وہ چائے لے کر آتا یا کھانا کھلاتا تو جتنی باتیں اُسے یاد آتیں سنا دیا کرتا تھا۔ امل بھی بچپن سے مہنگو کی باتیں سننے کا عادی تھا۔ جب مہنگو کو کام سے چھٹی ملتی تو باغ کے مالی سے یا پھر بلرام ماسٹر سے گپ مارنے چلا جاتا۔ اُسے گپ مارنے اور ناریل پینے کی بیماری تھی، جب تک گپ نہ مارتا اُس کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا اور وہی بلرام ماسٹر کی ساری باتیں بتایا کرتا تھا۔

بلرام ماسٹر کی بُری عادت تھی۔ شراب بہت پیتا تھا۔ اس کی زندگی بھی عجیب تھی۔ بہت دن تک مشن اسکول میں ماسٹر رہا۔ اسی زمانے میں اس نے ایک عیسائی عورت سے بیاہ کرنا چاہا۔ پادریوں نے روکا تو وہ عیسائی ہو گیا اور بیاہ کر لیا۔ مگر کبھی گرجا نہیں جاتا تھا۔ اور نہ پادریوں کی بات سنتا تھا۔ اس لئے پادریوں نے اسے سماج باہر کر دیا۔ بلرام ماسٹر بھی ویسا ہی آدمی تھا کہ پھر کبھی گرجا گھر نہ گیا نہ معافی مانگی اور مشن اسکول سے نکالے جانے کے بعد میونسپلٹی کے اسکول میں نوکری کر لی۔ اس کے کسی بچے نے بپتسمہ لیا اور نہ کسی کا نام عیسائی رکھا گیا۔ مگر وہ ہندو بھی نہ تھا۔ تہوار عیسائیوں کے ہی مناتا تھا، اور خود کو عیسائی ہی کہتا تھا۔

شراب پینے کی عادت سے بلرام ماسٹر ہمیشہ پیسے کی تنگی میں رہتا تھا اور شراب کے لالچ میں عجیب عجیب لوگوں سے دوستی کر لیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے اسے بڑی اُلجھن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک پنجابی ٹھیکہ دار کا منشی اُس کا دوست بن گیا۔ وہ روز شراب لے کر اس کے گھر آجاتا اور دونوں ساتھ بیٹھ کر پیتے تھے۔ ایک دن منشی نے

بلرام ماسٹر سے کہا کہ سجنی کا بیاہ اُس سے کردے۔ بلرام ماسٹر نے انکار کردیا۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہوگئی۔ اُس نے بلرام ماسٹر پر مقدمہ کردیا کہ سجنی سے اُس کا بیاہ ہوچکا ہے اور بلرام ماسٹر نے سجنی کو روک رکھا ہے۔ جب بات پھیلی تو لوگوں نے دونوں کو سمجھایا۔ بعض لوگوں نے بلرام ماسٹر سے کہا کہ اگر بیاہ ہوگیا ہے تو اسے رخصت کردے اور منشی سے یہ کہا۔ اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو مقدمہ اٹھالے۔ پھر لوگ دو خیال کے ہوگئے، ایک خیال کے لوگ کہتے بیاہ نہیں ہوا ہے منشی کی بدمعاشی ہے اور اُس نے جھوٹا مقدمہ چلایا ہے۔ اور کچھ لوگ کہتے کہ بیاہ ہوگیا ہے، بلرام ماسٹر کی شرارت ہے جو اُسے جانے نہیں دیتا۔ لیکن جب مقدمہ کھلا تو منشی حاضر بھی نہ ہوا۔ مگر طرح طرح کی باتیں اُڑتی رہیں۔ کوئی کہتا کہ بلرام ماسٹر نے منشی سے روپیہ لے لیا تھا۔ مگر بدل گیا۔ اور کچھ لوگ اسی پر قائم رہے کہ بیاہ ہوگیا ہے۔ جتنے منہ اُتنی باتیں، کون کس کی زبان روکتا۔ اس واقعہ کے بعد بلرام ذرا ہوشیار ہوگیا تھا اور باہر کے لوگوں کو گھر میں نہ لاتا تھا۔ مگر سجنی کا بیاہ نہ ہوسکا۔ جب کہیں سے بات چلتی تو ٹوٹ جاتی۔ اور دو آدمیوں کو تو سجنی نے خود ناپسند کرکے انکار کردیا تھا۔

مہنگو امل کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کے ماں باپ نے بھیج دیا تھا کہ امل کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ امل کی ساری عادتیں جانتا تھا اس نے امل کو بچپن سے پالا تھا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ امل جلد واپس نہیں جانا چاہتا تو وہ بہت گھبرایا اور روز روز اسکی خوشامد کرنے لگا کہ کلکتہ واپس چلے۔ مگر امل تیار نہ ہوتا تھا۔ اور جب مہنگو اُس کی خوشامد کرتا تو امل کہتا کہ رانچی کلکتہ سے اچھی جگہ ہے اور اس کے بغیر کلکتہ میں کوئی کام خراب نہیں ہورہا ہے۔ اور وہ چپ چاپ رہ جاتا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح جان چھڑا کر کلکتہ جائے۔

ایک دن خوب پانی برسا اور مہنگو بازار سے واپسی میں بھیگ گیا۔ بوڑھا آدمی تھا، بخار آگیا تو اور بھی گھبرایا کہ اب کیا ہوگا، رات کا کھانا تو جیسے تیسے پکا کر کھلادیا

"لیکن فکر مند ہو گیا کہ صبح سویرے، ال کو چائے کون بنا کر دے گا، کھانا کون پکا کر کھلائے گا۔ پھر یہ کہ ال کی ہر چیز صاف ستھری اور اچھی ہونی چاہیئے۔ اُس نے بلرام ماسٹر سے رائے لی۔ بلرام ماسٹر نے کہا کہ سجنی کام کر دے گی، وہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہے اور گھر پاس ہی ہے۔ اس لئے کوئی حرج نہیں، وہ اجازت دے دے گا۔ اور مہنگو کو اطمینان ہو گیا تھا اور اُس نے ال سے آکر کہہ دیا تھا اور ساری بات سجنی کو سمجھا دی تھی، اور صبح سجنی چائے بنا کر ال کے پاس لائی تھی۔

ال بہت دیر تک لیٹا ہوا پڑھتا رہا، پھر اٹھ بیٹھا، انگڑائی لی۔ اور مہنگو کو آواز دی۔ اسے یاد نہ رہا تھا کہ مہنگو بیمار ہے۔ اسکی آواز سن کر سجنی آگئی تو اُسے یاد آگیا کہ مہنگو بیمار ہے۔ ال نے سجنی کو دیکھا تو بولا۔

"مالی سے کہہ دو غسلخانے میں پانی رکھدے۔"

سجنی نے کہا۔ "پانی تو بہت دیر سے رکھا ہے۔"

ال اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ذرا میرے سوٹ کیس سے ایک جوڑا کپڑا نکال دو۔"

سجنی بولی۔ "کپڑا غسلخانے میں رکھ دیا ہے اور داڑھی بنانے کو گرم پانی بھی۔ اور۔"

"اور کیا؟"

سجنی نے جواب دیا۔

"اور ناشتہ بھی تیار ہے۔"

ال مسکرایا اور بولا۔ "تم کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"مہنگو چاچا نے ساری باتیں بتادی ہیں۔"

ال چپ ہوگیا۔ سجنی چلی گئی۔ ال سوچنے لگا کتنی سمجھ دار لڑکی ہے۔ مہنگو نے سمجھا دیا تو ہر کام اسی طرح کر رہی ہے جیسے اُسے برسوں سے جانتی ہے۔ جب وہ غسلخانے میں پہنچا تو وہاں ہر چیز رکھی تھی۔ اور جب داڑھی بنا کر اور نہا دھو کر کپڑے بدل کر کمرے میں واپس

آیا تو میز پر ناشتہ اور چائے کا سامان رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ کرسی پر بیٹھا سجنی میز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"چائے بنا دوں بابو"

انل نے ایک نظر اُس کو دیکھا اور چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتے میں ہر چیز صاف سُتھری تھی اور مزے دار۔ انل نے کچھ بات کرنی چاہی مگر کیا بات کرتا۔ پھر بھی اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"تم کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نہانے کے بعد فوراً ناشتہ کرتا ہوں"۔

سجنی نے گردن جھکالی اور بولی۔

"میں نے ہر بات مہنگو چاچا سے پوچھ لی ہے کہ آپکو کچھ کہنا نہ پڑے"۔

انل نے ایک نظر اُس کو دیکھا اور چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کرتے وقت ایک لفظ بھی نہ بولا۔ سجنی خود ہی بولی۔

"مہنگو چاچا نے کہا ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے"۔

انل سجنی کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"تم کہاں تک میری تکلیفوں کا خیال کرو گی"۔

سجنی نے اُسی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔ "جہاں تک ہو سکے گا"۔

انل اسکی سادگی پر ہنس پڑا اور چپ چاپ ناشتہ کرتا رہا۔ جب ناشتہ ختم ہونے پر آیا تو اُس نے چائے کی پیالی میں چائے ڈال دی۔ مہنگو نے اُسے بتا دیا تھا کہ انل خود چائے بنا کر نہیں پیتا۔ بلکہ چائے پیالی میں ڈالکر اُسے دینی پڑتی ہے۔ انل نے چائے چپ چاپ پی لی۔ پھر اُس نے دوسری بار پیالی بھر دی۔ انل نے اُسے بھی پی لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر سر جھاڑنے لگا۔ سجنی بولی

"برتن رکھ آؤں بابو تو سر میں تیل لگا دیتی ہوں۔ مہنگو چاچا نے کہا تھا"۔

انل نے کہا۔ "نہیں نہیں، میں تیل ڈال لوں گا۔"

سجنی بولی۔ "نہیں بابو۔ تم کو عادت نہیں ہے۔"

سجنی جلدی سے برتن رکھ کر آئی اور سنگار میز پر سے تیل کی شیشی اُٹھا کر بولی۔

"بابو تم بیٹھ جاؤ، میں تیل ڈال دیتی ہوں۔"

انل نے کہا۔ "نہیں نہیں"۔ اور شیشی اسکے ہاتھ سے لے لی۔ شیشی لینے میں اُس کا ہاتھ سجنی کے ہاتھ سے چھو گیا۔ اُسکے سارے جسم میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی۔ سجنی نے پھر شیشی اُسکے ہاتھ سے لے لی اور بولی۔ "بابو بیٹھ جاؤ، تیل ڈال دوں، تم کو تکلیف ہوگی تو مہنگو چاچا کہے گا کہ کچھ خیال نہ کیا۔"

انل کچھ نہ بول سکا۔ چپ چاپ مسہری کے کنارے بیٹھ گیا اور سجنی اسکے سر میں تیل ڈال کر دبانے لگی۔ اُسکے نرم ہاتھ میں جیسے جادو تھا۔ انل کو محسوس ہوا کہ وہ مسہری سے اونچا اُٹھتا جا رہا ہے۔ ہر روز نہانے کے بعد مہنگو اُسکے سر میں تیل ڈالتا تھا۔ مگر سجنی کے ہاتھ میں نہ جانے کیا جادو تھا ایسا مزا اُسے تیل ڈالنے میں کبھی نہ آیا تھا۔ سر میں تیل ڈال کر دباتے ہوئے سجنی کے جسم کا ہر حصہ جیسے تھرک رہا تھا۔ سجنی کے دونوں ہاتھ انل کے سر پر تھے اور وہ سجنی کے جسم کے ہر حصے کو غور سے دیکھ رہا تھا اُس کا جسم کتنا گٹھا ہوا تھا اور خاص کر سینے کا اُبھار۔ انل کی آنکھیں جیسے جم کر رہ گئیں، اور سارے جسم میں بجلی سی دوڑتی رہی۔ جب سامنے کے حصے کو اچھی طرح دبا چکی تو بولی۔

"بابو اب ذرا مڑ جاؤ۔"

انل نے اُسکی طرف پیٹھ کر دی۔ سوچا کہ اچھا ہے۔ وہ دیر سے اس کے سینے کے اُبھار اور جوان جسم کی بو سے عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سوچا کہ اب نظر سینے کے اُبھار پر پڑے گی اور نہ بے چین کرنے والی بو ناک میں آئے گی۔ سجنی نے اُس کا سر دبانا شروع کیا اور جو ذرا اسکی پیٹھ پر جھک کر سر کو دبایا تو اُسکا سینہ انل کی پیٹھ سے چھو گیا۔ اور

ال کو ایسا معلوم ہوا کہ اُس کا جسم جھنجھنا اُٹھا۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا اور بولا۔

"بس اب تم جاؤ۔"

سجنی نے کہا۔ "تھوڑا تیل اور برابر کر دوں۔"

لیکن ال نے کہا۔ "نہیں۔" اور کتاب لے کر لیٹ گیا۔ سجنی تھوڑی دیر کھڑی رہی لیکن ال نے اسکی طرف دیکھا تک نہیں تو چلی گئی۔ اُسکے جانے کے بعد ال سوچنے لگا عجیب لڑکی ہے، اس قدر سیدھی اور سادہ ہے کہ اسے کوئی احساس ہی نہیں، یا شاید چالاک ہے اور اسکا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ سب کچھ جان بوجھ کر کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ اس میں دلچسپی لوں۔ مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی اور اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ اُس نے کتاب رکھدی اور لیٹا لیٹا سوچتا رہا۔ کبھی سوچتا کہ یہ لڑکی آوارہ ہے اور کھُل کھیلنا چاہتی ہے اور کبھی سوچتا کہ بالکل سادہ ہے، اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ غیر آدمی سے کس طرح ملنا چاہیئے۔ اور اگر یہی حال رہا تو ایک دن دھوکا کھائے گی۔ مگر اُسے خیال آیا کہ اس میں اُس کا اپنا کیا نقصان ہے۔ یہ بھی دلچسپی ہے۔ اگر کوئی جوان لڑکی کسی جوان آدمی سے اتنی دلچسپی لے تو اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ سجنی کو پکارے اور اُس سے باتیں کرے۔ اور دیکھے کہ وہ کس حد تک آگے بڑھتی ہے۔ مگر وہ سوچتا ہی رہا، پکار نہیں سکا، اور سوچتے سوچتے سو گیا۔

جب اُسکی نیند ٹوٹی تو اس نے دیکھا کہ سجنی دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ ال نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" ال کی آواز میں روکھا پن تھا۔ سجنی نے اُسے سمجھا اور اُس کا دل چھوٹا ہو گیا۔ پھر بھی وہ بولی۔

"کھانا تیار ہے۔"

"اچھا۔"

اُسکی آواز میں پہلے سے بھی زیادہ روکھا پن تھا۔ سجنی سر جھکا کر چلی گئی۔ ال اُٹھ

بیٹھا۔ گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ اُس نے سوچا پانچ گھنٹے تک سوتا رہا۔ اس طرح وقت خراب کرنا اُسے پسند نہ تھا۔ اتنی دیر میں وہ کم سے کم ساٹھ ستر صفحے ضرور پڑھ لیتا۔ مگر اُسے بے وقت نیند کیسے آگئی۔ پہلے تو کبھی ناشتہ کے بعد اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ کون سی نئی بات ہو گئی جو اُسے اتنی گہری نیند آگئی۔ بہت سوچنے پر ایک ہی بات اُس کی سمجھ میں آئی اور وہ یہ کہ یہ اثر سجنی کے سر میں تیل ڈالنے کا تھا۔ اور یہ خیال آتے ہی اُسکے سارے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ اُس نے سوچا اب سجنی سے دور ہی رہے گا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ مرد لوہا ہے تو عورت تپی ہوئی بھٹی ہے۔ اُسکے پاس جانے ہی سے نرم پڑ جاتا ہے۔ زیادہ دیر تک پاس رہنے سے اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ پھر عورت جیسا چاہتی ہے اُسے بنا لیتی ہے۔

ال نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آیا تو کھانا میز پر رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ کھانے کے لئے میز پر بیٹھتے ہی اور دنوں سے کچھ فرق نظر آیا۔ بھنگو جب کھانا پکاتا تھا تو دو تین طرح کی ترکاری سے زیادہ نہ ہوتی تھی، مگر اس وقت کھانے میں تھوڑی تھوڑی کر کے ایک دو نہیں دس چیزیں موجود تھیں۔ ایک ہی چیز اُس نے دو دو تین تین طرح سے پکائی تھی۔ جیسے ہی اُس نے کھانا چکھا اُسکی طبیعت خوش ہو گئی۔ ایک دو تین چار۔ اس نے ہر ترکاری چکھ لی۔ ساری ترکاریاں مزے دار تھیں۔ ال سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بول پڑا۔ "کھانا تو تم مزیدار پکاتی ہو"

سجنی کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑ گئیں اور وہ بولی "کھانا پسند آیا بابو"

"بہت پسند آیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم اتنا مزے دار کھانا پکاتی ہو"

ال بھول گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ سجنی سے دور دور ہی رہے گا۔ اور باتیں نہیں کرے گا۔ مگر کھانا کھانے کے بعد وہ بھول گیا اور بول پڑا۔ سب کچھ بھول گیا۔ سجنی بھی خوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے ال کے روکھے پن سے جو جھٹکا لگا تھا وہ دور ہو گیا اور سجنی

بولی: "مدر نے کھانا پکانا سکھایا ہے۔ میں تو بہت اچھا کھانا پکاتی ہوں۔"

امل چُپ رہا۔ سجنی بولی۔ "رات کو نسی چیزیں پکاؤں گی۔ مگر مچھلی تو ہے نہیں۔"

امل بولا۔ "مہنگو تو بیمار ہے، مچھلی کون لائے گا۔"

"بھیّا یا بابا لادے گا۔" سجنی نے کہا۔

امل بول پڑا۔ "وہ لوگ میرے لئے کیوں تکلیف کرینگے۔"

"اس میں تکلیف کیا ہے بابو۔ بازار تو جاتے ہی ہیں سب، آدمی کا کام آدمی ہی کرتا ہے۔"

امل کھانا کھا کر اٹھا تو اُس نے غور کیا۔ سارا کمرہ صاف تھا، اور اُس کی ہر چیز ٹھکانے سے رکھی ہوئی تھی، جس چیز کو جہاں ہونا چاہیئے تھا، وہیں تھی۔ امل نے پوچھا۔ "یہ سب کس نے کیا ہے؟"

"میں نے ....." سجنی بولی۔ امل چُپ ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ اس نے کس طرح اسکے مزاج کو سمجھ لیا ہے۔ اگر کچھ دنوں اور بھی یہ رہگئی تو پھر اس کو چھوڑنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ عورت بہت خطرناک ہوتی ہے جو کسی مرد کے آرام کا اتنا زیادہ خیال رکھے۔ عورت کیا مرد بھی اگر نوکر ہو اور آدمی اسکا عادی ہو جائے تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس کا باپ ریتو کا عادی ہو گیا تھا، حالانکہ وہ بہت ہی احمق ہے۔ دن بھر ڈانٹ سنتا ہے۔ اس کا باپ دن بھر اس پر خفا ہوتا ہے۔ مگر اس کو نکال نہیں سکتا۔ یہ کر کے بھی اُس نے دیکھ لیا تھا، ریتو کو کئی بار غصے میں نکال چکا تھا اور جب بھی نکالا دوسرے ہی دن آدمی بھیجکر اُسے بلوالیا۔ ریتو کے بغیر اسے چین ہی نہ آیا۔ خود وہ مہنگو کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر سجنی نے چند ہی گھنٹوں میں محسوس کرا دیا تھا کہ اگر سجنی رہے اور مہنگو نہ بھی رہے تو اُسے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن سجنی کا رہنا کس قدر خطرناک بات تھی۔ اُس نے پھر سوچا کہ جب تک ہے اسی طرح کام لے گا۔ اور جب مہنگو اچھا ہو جائے گا تو چلی جائیگی۔ اُس نے

یہ بھی طے کر لیا کہ اسکے بارے میں کچھ نہ سوچے گا۔

سجنی برتن لیکر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں دو تین لفافے لے کر واپس آئی۔ لفافے دیکر بولی۔"بابو اب اور تو کوئی کام نہیں"۔

اہل نے ایک لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔"نہیں"۔

"اب گھر جاتی ہوں۔ شام کو آؤنگی چائے کے وقت"۔

اہل کچھ نہ بولا۔ سجنی چلی گئی۔ اہل خط پڑھنے لگا۔ خط نرملا کا تھا۔ وہی رام کہانی تھی۔ پربھات بابو اپنی ضد پر قائم تھے۔ حالانکہ اسکی ماں نے خوب سمجھایا تھا کہ اب کوئی بات نہیں مگر پربھات بابو اپنی ضد پر قائم تھے۔ اُس پر اُسکی ماں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے اہل سے بیاہ کی بات ختم کردی تو یہ بھی جان لو کہ نرملا کسی اور سے بیاہ نہیں کریگی۔ اس پر پربھات بابو نے بالکل انگریزوں کی طرح کہا تھا کہ نرملا کو اس کا حق ہے، اگر وہ ساری زندگی شادی نہ کرنا چاہے تو کوئی اُس پر دباؤ نہیں ڈال سکتا۔ اور اہل پڑھ کر ہنسنے لگا۔

اہل نے سوچنا شروع کیا۔ آخر اس کھینچ تان کا انجام کیا ہوگا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ پربھات بابو نے اسکی غیرت کو للکارا ہے۔ اور اُن کی ساری ضد کا جواب صرف ایک ہے کہ وہ شادی کرنے سے انکار کردے اور یہ جھمیلا ہی ختم ہو جائے۔ مگر نرملا کے خطوں کا ڈھیر اُسکے دماغ کے کونے کونے میں بھرا تھا۔ نرملا کی باتیں یاد آتی تھیں، وہ جانتا تھا کہ نرملا اُس کی بھاوج کے پاس صرف اس لئے آتی تھی کہ اُس سے ملاقات ہو اور اُس سے باتیں ہوں، اور اُس کی ذات سے نرملا کی دلچسپی کا اندازہ اسی سے ہوتا تھا، کہ جب نرملا کو معلوم ہوا کہ اہل کھانے کا شوقین ہے تو اُس نے سیکڑوں چیزیں پکانا خود سیکھ لیں۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اہل کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق ہے تو اُس نے خود پڑھنا لکھنا کم کر دیا تاکہ وہ اہل کو آرام پہنچا سکے۔ اُس نے اپنی زندگی اس طرح ڈھال لی تھی کہ اہل کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ اور ساری باتیں اہل جانتا تھا۔ اس کے لئے ناممکن تھا کہ تصور میں بھی نرملا

کو بھول جائیں بات سوچے۔

لیکن اسے محسوس ہوا کہ سجنی زبردستی اسکی زندگی میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتا، مگر سجنی داخل ہو رہی ہے۔ اگر اس نے سجنی کے سامنے آنے سے روکا تو ضرور داخل ہو جائے گی۔ مہنگو کی بیماری کی حالت میں اسے سجنی کی ضرورت تھی، اس نے سوچا کہ سجنی سے باتیں نہ کرے گا۔ اور کسی طرح بھی ایسا موقع نہ دے گا کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ہو۔

جب شام کی چائے لے کر سجنی آئی تو امل نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چائے پینے کے وقت بھی ایک کتاب دیکھتا رہا۔ اور جب چائے ختم کر لی۔ تو چپ چاپ لیٹ گیا۔ سجنی برتن لے کر چلی گئی مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ سجنی کے جانے کے بعد امل سوچتا رہا۔ آخر سجنی نے کیا غلطی کی ہے جو اس سے باتیں نہ کرنے کا اس نے فیصلہ کیا۔ اس کی تو کوئی غلطی نہیں، اگر خود اس میں کوئی کمزوری ہے تو اسکی ذمہ داری سجنی پر نہیں، یہ تو غلط ہے۔ پھر اس نے خود ہی دل ہی دل میں کہا کہ آخر کیا ضروری ہے کہ سجنی سے باتیں کرے یا اس سے ذرا بھی دلچسپی لے، خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ آخر وہ کام کرنے والی معمولی عورت ہے۔ اس سے اس کا کیا ناتا ہے۔

امل اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا اور کپڑے بدل کر سیر کے لئے باہر چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ شام کو اسی طرح دور رہے گا اور اتنی دیر کر کے آئے گا کہ وہ کھانا پکا کر چلی جائے گی اور چلتے چلتے مالی سے اس نے کہہ دیا کہ سجنی سے کہہ دے کھانا نکال کر میز پر رکھ دے گی اور چلی جائے گی۔ دیر تک اسکے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور دیر تک وہ ٹہلتا رہا۔ پھر سینما دیکھنے چلا گیا۔ اور جب دس بجے رات کو واپس آیا تو اسکی حیرت کی کوئی حد نہیں رہی۔ سجنی باورچی خانہ کے دروازے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس کے سر سے آنچل سرک گیا تھا اور لمبے لمبے بال زمین پر پڑے تھے۔ بلاؤز کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔

اور اسکی گردن سے نیچے تک کا حصہ صاف نظر آرہا تھا۔

انل تیر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ انل کے پاؤں کی چاپ سن کر سجنی کی نیند ٹوٹ گئی اور وہ اُسکے پیچھے پیچھے کمرے میں آکر بولی۔ "کھانا لاؤں بابو۔"

انل نے اسکی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم گئیں نہیں گھر"

"نہیں۔"

"میں نے مالی سے کہہ دیا تھا۔"

"ہاں مالی بولا تھا۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو جاتا۔"

"مگر تم اتنی رات گئے اکیلی ......"

سجنی بات کاٹ کر بولی "بابا سے کہہ دیا ہے۔ ماں تو ابھی گئی ہے۔"

"مگر پھر بھی اچھا نہیں لگتا۔"

کوئی ہرج نہیں بابو۔"

"مگر تم کو جو تکلیف ہوئی۔"

"میری فکر نہ کرو بابو۔ تم ٹھنڈا کھانا کیسے کھاتے ......"

"انل چپ چاپ کمرے میں چلا گیا اور کپڑے اُتارنے لگا۔

سجنی نے کھانا لاکر میز پر لگا دیا۔ انل منہ ہاتھ دھو کر تولیہ سے ہاتھ پونچھتا آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ سجنی کو دیکھ کر وہ کڑھا ہوا تھا۔ اُس نے چلے جانے کو کہہ دیا تھا مگر وہ نہیں گئی تھی۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ اہمیت دکھانا چاہتی ہے یا زبردستی رہنا۔ اور خیال ہوا کہ مہنگو جیسے ہی اچھا ہو جائے گا اُسے رخصت کر دے گا لیکن جب اُس نے کھانا کھایا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ ٹھیک ہی بیٹھی رہی، کھانا اُس نے بڑے شوق سے پکایا تھا اور اگر ٹھنڈا ہو جاتا تو بدمزہ ہو جاتا۔ کھانے کے لائق نہیں رہتا۔

کھانا کھاتے کھاتے انل نے پوچھا۔ "اب مہنگو کیسا ہے؟"

"مہنگو چاچا کو بخار ہے۔ بھیّا نے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لا دی ہے۔"

امل چُپ ہو گیا۔ کھانا کھاتے کھاتے ایک نظر سبجنی کو دیکھا۔ وہ چُپ چاپ دروا پر کھڑی تھی، امل اور کچھ نہ بولا، کھانا کھاتا رہا۔ خود سبجنی بولی۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہوئی کیا بابو۔ تم رنج ہو۔"

امل نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ سبجنی کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور گردن جھکی ہوئی تھی۔ امل دل دُکھ گیا۔ اُس نے واقعی زیادتی کی تھی۔ خواہ مخواہ اُس سے روکھے انداز میں اُس باتیں کی تھیں، حالانکہ اُس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ بولا۔ "نہیں تو رنج ہونے کیا بات ہے۔"

"میں ہی غلط سمجھی، میں جانتی ہوں۔"

امل کو جھٹکا سا لگا۔ آخر یہ کیا چاہتی ہے، اور اُس نے ایک ہی جملے کے جلد جلدی کئی معنی لگا ڈالے اور اس خیال سے اُس کو عجیب الجھن ہوئی کہ سبجنی نے یہ نہ سم ہو کہ اُسکے دل میں کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے یا ہو رہی ہے۔ اُس نے کہا۔ "نہیں کوئی نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

سبجنی بولی۔ "تمھارا دل دکھا ہوا ہے بابو۔ مہنگو چاچا سے ہم نے سب سُنا ہے۔"

امل کا سارا بدن جیسے جھنجھنا اُٹھا اُس نے جلدی سے آخری نوالہ منہ میں رکھا او بولا "برتن اُٹھا لو۔"

پانی پی کر وہ اُٹھنے لگا تو سبجنی بولی۔ "بس! کچھ بھی نہ کھایا۔"

"ہاں بس لے جاؤ۔ جی نہیں چاہتا۔"

"کیا بات ہے بابو؟"

"کوئی بات نہیں نیند آ رہی ہے۔ دیر ہو گئی تم بھی جلدی چلی جاؤ۔"

امل منہ ہاتھ دھو کر آیا اور مسہری پر لیٹ گیا۔

اُس نے دیکھا بستر بہت صاف سُتھرا بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی چیز بھی بکھری ہوئی نہیں تھی۔ امل کے دل میں ننوں اور پادریوں کی تعلیم کے لئے بڑی عزت پیدا ہوئی۔ بچپن میں اُس نے بھی کانونٹ اور پبلک اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ اور جانتا تھا کہ بچوں پر کتنی نگرانی رکھی جاتی ہے اور یہ کہ کتنی محنت سے ہر بات بچوں کو سکھائی جاتی ہے۔ یہی وجہ تو ہے جو سجنی کو ہر بات کا ڈھنگ ہے۔

امل نے فوراً کتاب اُٹھالی اور پڑھنے لگا اور کھو گیا۔ صبح کے وقت جب امل کی نیند ٹوٹی تو مسہری کے پاس چھوٹی میز پر چائے رکھی تھی اور ایک گلاس میں پانی رکھا ہوا تھا۔ اُس نے بھی کلی کی اور اُسکے بعد انتظار کرنے لگا کہ سجنی آئے اور چائے بنا کر دے۔ لیکن سجنی نہیں آئی۔ سجنی نے سمجھا تھا کہ اسکا کھڑا رہنا امل کو پسند نہیں اور وہ جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ اُس نے یہ نہیں چاہا کہ کوئی ایسا کام کرے جو امل کو پسند نہ ہو۔ مگر وہ ذرا حیرت میں ضرور تھی۔ مہنگو نے اُسے بتایا تھا کہ امل جب چائے پیئے یا کھانا کھائے تو اُسکے پاس رہنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ نہ چائے پی سکتا اور نہ کھانا ہی کھا سکتا ہے۔ اُسے اُسوقت بات کرنے کی عادت ہے۔ اور مہنگو سے اُس کی عادت کے بارے میں سُننے کے بعد ہی وہ جاکر کھڑی ہو جاتی اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مہنگو نے سارا قصہ اُن سب کو بتا دیا تھا کہ امل کس طرح رانچی آیا ہے اور اچھا ہونے کے بعد بھی کلکتہ کیوں واپس نہیں جا رہا ہے اور سجنی جو بھی کر رہی تھی محض ہمدردی کی وجہ سے کر رہی تھی۔ لیکن امل کا رُخ دیکھ کر اُس نے خود کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب سجنی چائے کے برتن اُٹھاکر لے جانے کو آئی تو اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ امل چُپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، اور چائے پیالی میں ڈالی تک بھی نہ گئی تھی۔ سجنی نے پوچھا۔ "چائے نہیں پی بابو"

"نہیں" اِمل بولا۔

سجنی نے پوچھا۔"کیوں ؟"

اِمل نے اسی طرح گردن جھکائے ہوئے جواب دیا۔"تم نے پیالی میں انڈیل کر دی ہی نہیں۔"

سجنی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ اُس سے بھول ہوگئی تھی۔ مہنگو نے بتایا تھا کہ اِمل کبھی خود چائے ڈال کر نہیں پیتا بلکہ اُسے چائے ڈال کر دینی پڑتی ہے۔ اُس نے دیکھا چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اُس نے ٹرے اُٹھائی اور جاتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے بھول ہوگئی بابو، معاف کر دینا ابھی لاتی ہوں۔"

اِمل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو بولا۔"ذرا جلدی لانا چائے۔"

سجنی تھوڑی ہی دیر میں چائے لے کر آگئی۔ اور پیالی میں اُنڈیل کر پیالی اُس کے آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔"مجھ سے غلطی ہوگئی بابو معاف کر دو۔"

اِمل نے اُس کو غور سے دیکھا۔ سچ مچ سجنی کے چہرے پر اُداسی تھی۔ اِمل نے کہا "میں سمجھا کہ شاید تم رنج ہو۔"

سجنی نے فوراً جواب دیا۔"میری مجال ہے بابو، میں تو داسی ہوں۔"

اِمل اُس کو حیرت سے تکنے لگا۔

سجنی بولی۔"میں تو سمجھی کہ تم کو میرا کھڑا رہنا پسند نہیں۔ اسلئے۔۔۔"

اِمل نے گردن جھکالی اور بولا۔"نہیں ایسی بات نہیں۔"

سجنی اور نزدیک آگئی اور بولی۔"تو میں ہی غلط سمجھی تھی۔"

سجنی نے چائے کی دوسری پیالی بھردی اور اِمل چائے پینے لگا اور سوچتا رہا یہ لڑکی کس خمیر سے بنائی گئی ہے اور اسکے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوگیا کہ آخر یہ کیا چاہتی ہے۔

لیکن وہ سمجھ نہیں سکا اور جب وہ چائے پی چکا اور سجنی برتن لیکر چلی گئی تو دیر تک یہی سوچتا رہا لیکن اسکی سمجھ میں کوئی بات نہ آسکی۔

تین چار دن میں مہنگو اچھا ہوگیا اور کام کرنے لگا۔ سجنی اپنے گھر چلی گئی۔ پہلے دن تو امل کچھ بھی نہ بولا۔ مگر دوسرے ہی دن اُس نے محسوس کیا کہ اسکی زندگی سے کوئی بڑی اہم چیز نکل گئی ہے۔ حالانکہ مہنگو بچپن سے اسکے پاس تھا اور ایک ایک کام امل کے مزاج کے مطابق کرتا تھا، خود سجنی کو اُس نے بتایا تھا کہ امل کی کیا کیا عادتیں ہیں اور اُسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ مگر دن ہی بھر میں معلوم ہوا کہ جیسے مہنگو کو کچھ نہیں آتا اور سجنی اُسکی طبیعت اور ضرورت کو جانتی تھی، اور مہنگو کچھ نہیں جانتا۔ پہلے دن تو وہ کچھ نہیں بولا۔ مگر دوسرے دن جب مہنگو چائے لے کر آیا تو امل نے پوچھا "کیا سجنی چلی گئی"!

مہنگو نے کہا۔ "ہاں، اب اسکی ضرورت بھی کیا ہے"!

امل نے مہنگو کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا "مہنگو! اُسکی ضرورت ہے۔ چار دنوں میں جیسا مزے دار کھانا اُس نے کھلایا، ویسا مزے دار کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا اور نہ جانے وہ میری طبیعت کو کیسے پہچان گئی تھی"!

امل کچھ اور نہ کہہ سکا۔ مہنگو اُسکا منہ دیکھنے لگا۔ امل کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ امل نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ خود اُسکے گھر میں ایک دو نہیں چھ سات دائیوں کی لڑکیاں تھیں اور وہ سب امل کے بھائیوں کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ امل کے بڑے بھائی کمل اور بمل کے بارے میں وہ بہت سی باتیں خود جانتا تھا۔ اُن دونوں کو اکثر پیاس اُس وقت لگتی تھی جب وہ کوٹھے پر اکیلے ہوتے تھے۔ اور کسی نہ کسی لڑکی کو پکار کر پانی مانگا کرتے تھے، اور مہنگو خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں کے پانی مانگنے کا مطلب کیا ہوتا تھا۔ کمل کی تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اُسی وقت ایک لڑکی پھولو کے پیٹ میں بچہ رہ گیا تھا اور اُس نے سب سے کہہ دیا تھا کہ بچہ کمل

کا ہے۔ اور سرت بابو نے جلدی سے ایک آدمی کو ایک ہزار روپیہ دیکر بھولو کا اس سے بیاہ کرا دیا تھا اور اس طرح بات دب گئی تھی۔ بمل کے بارے میں بھی سب لوگ کہتے تھے کہ وہ بھی کمل سے مختلف نہیں۔ مگر امل کے بارے میں تو مشہور تھا کہ اس کو اپنی کتابوں کے سوا کسی اور چیز سے دل چسپی نہیں۔ وہ تو کبھی کسی لڑکی سے پانی بھی نہیں مانگتا تھا۔ مگر اب وہی امل سجنی کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

مہنگو نے کہا: "ہاں۔ اب ہم اچھے ہو گئے تو اسکی ضرورت کیا ہے؟"

امل نے کہا۔ "کیا اس کو بلا نہیں سکتے؟"

مہنگو چپ ہو گیا، اس نے سوچا آخر یہ بھی کمل اور بمل کا بھائی ہے، ایک ہی ماں باپ کا خون سب کی رگوں میں ہے، کسی کی نس پہلے پھڑکی اور کیسکی بعد میں۔

امل نے کہا: "مہنگو کھانا اسی سے پکواؤ۔ تم ابھی آرام کرو۔"

مہنگو نے کہا: "اچھی بات ہے۔"

اور اسی شام سے سجنی پھر آگئی۔ سجنی کے آنے کے بعد امل نے سوچنا شروع کیا کہ اس نے سجنی کو بلا کر صحیح کیا یا غلط۔ لیکن بہت دیر تک اس پر سوچتے رہنے کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کبھی سوچتا کوئی بات نہیں، اس سے آرام تھا۔ اور اسکے آنے سے زیادہ آرام ہو گا۔ اس میں برائی کیا ہے۔ لیکن پھر وہ سوچتا نہ جانے مہنگو کیا سوچے کیا سمجھے۔ اور یہ بھی کہ نہ جانے وہ کلکتہ کیا لکھ بھیجے اور وہاں اسکے ماں باپ کیا خیال کریں لیکن آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ اب تو جو بھی ہونا تھا وہ ہو چکا۔ لیکن سجنی سے اسے جو آرام پہنچتا ہے اس سے کیوں محروم رہے۔ ایک بار تو وہ یہ سوچکر کانپ ہی گیا کہ اتنے دنوں میں تو وہ دل اور دماغ پر اس قدر چھا گئی۔ اگر زیادہ دن رہے گی تو کیا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر اسکے سامنے بے بس ہی ہو جائے اور یہ سوچکر وہ سچ مچ گھبرا گیا۔ لیکن اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ بلا کر فوراً ہی پھر واپس

دینا بھی کوئی عقل کی بات نہ تھی۔

ایک دن انل چائے پی کر بیٹھا ہی تھا کہ مہنگو نے آکر بتایا کہ کوئی ملنے آیا ہے۔ انل کپڑے بدل کر ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک نے اپنا نام سنیل کمار اور دوسرے نے سوشیل کمار بتایا۔ دونوں کلکتہ کے رہنے والے تھے اور رانچی صرف سیر کی غرض سے آئے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے صرف ملنے آگئے تھے۔ پاس ہی میں کسی مکان میں رہتے تھے اور ان میں ملنے کے لائق کوئی آدمی نہ تھا۔ انل نے چائے منگائی اور دونوں کو پلائی اور دیر تک باتیں کرتا رہا، پھر وہ دونوں چلے گئے۔ انل کو یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ کون لوگ تھے اور کیوں آئے تھے۔ اُن سب نے جو بھی بتایا تھا اُسے مان لیا اور بھول بھی گیا کہ کوئی ملنے آیا تھا۔

انل روز روز سوچتا کہ کیا کرے۔ سجنی اس کے لئے ایک مستقل مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ کام کر رہی تھی، اور صبح سے شام تک انل کے کاموں میں اس طرح لگی رہتی تھی کہ اُسے اور کوئی ہوش بھی نہ رہتا تھا۔ مہنگو اُسے دیکھتا اور چپ رہتا۔ کبھی سوچتا کہ انل بھی کمل اور بمل کے راستے پر چل پڑا ہے۔ مگر اُسے کوئی موقع ایسا نہیں ملتا کہ اس قسم کا شک بھی کرے، پھر مہنگو نے خود بھی دیکھا تھا کہ وہ کتنا اچھا کھانا پکاتی ہے اور انل کی ہر چیز کا کتنا خیال کرتی ہے۔ اُسکی ہر چیز کو درست رکھنے میں کس طرح اُلجھی رہتی ہے اور اُس سے زیادہ باتیں بھی نہیں کرتی۔ مہنگو نے سمجھ لیا کہ انل صرف آرام چاہتا ہے، اور اس کی وجہ سے اسے آرام ہے اور کوئی بات نہیں۔ پھر اُس نے سوچنا بھی چھوڑ دیا۔

ایک دن دو پہر کا کھانا کھا کر انل لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ سجنی یکایک آکر اُسکے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح آکر کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ انل نے پوچھا: "کیا بات ہے سجنی؟"

سجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انل نے پھر پوچھا: "کیا ہے۔ کچھ کہوگی بھی۔"

سجنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ معلوم ہوا کہ جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ امل اس کو روتا دیکھ کر گھبرا گیا اور پوچھتا رہا کہ بات کیا ہے؟ مگر وہ کچھ نہ بولی بلکہ امل کے زیادہ پوچھنے پر وہاں سے چلی گئی۔ امل پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا آخر بات کیا ہے؟ مگر اُسکی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ امل نے مہنگو کو پکارا اور اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ سجنی کیوں رو رہی ہے۔ مگر مہنگو صرف اتنا بتا سکا کہ صبح سے ہی اس کا یہ حال ہے، ذرا ذرا سی بات پر اُسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ امل نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ تم نے تو کچھ نہیں کہا ہے اور وہ قسمیں کھانے لگا۔ امل نے اپنے دل میں عجیب قسم کی بے چینی محسوس کی۔ آخر بات کیا ہے؟ اس نے سوچا پھر سوچنے لگا۔

پانچ بجے کے قریب سجنی چائے لے کر آئی، اسکی آنکھیں لال تھیں پپوٹے پھولے تھے۔ اور چہرہ بھرایا ہوا تھا۔ امل نے اُسے غور سے دیکھا، اُسکے چہرے پر گہری اداسی چھائی تھی۔ اور جب اُسکے لئے وہ چائے پیالی میں اُنڈیلنے لگی تو آنسو کا ایک قطرہ ٹرے میں آ کر گرا اور امل جیسے اچھل پڑا۔ چائے کی پیالی ٹرے سے اُٹھاتے ہوئے اُس نے پوچھا "سجنی کیا بات ہے؟"

سجنی مڑ کر باہر جانے لگی۔ امل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "تمھیں بتانا ہی ہوگا۔"

سجنی آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ امل نے جلدی سے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا اور ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ "آخر تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

سجنی نے بڑی مشکل سے پوچھا۔ "کلکتہ جا رہے ہو بابو۔ مہنگو چاچا کہہ رہا تھا۔"

معلوم ہوا کہ امل کے سارے بدن میں چنگاریاں پھیل گئیں۔ اُس نے غور سے سجنی کو دیکھا، اور بولا۔ "اب تو جانا ہی چاہیئے، چھ مہینے سے بھی زیادہ ہو گئے۔"

سجنی بولی۔ "مہنگو چاچا کہہ رہا تھا کہ جلد ہی تمھارا بیاہ ہونیوالا ہے۔"

اِل کو ایسا محسوس ہوا کہ چنگاریاں شعلے بن گئیں۔ اُس نے بڑی بے چینی محسوس کی اور بڑی مشکل سے بولا۔ "سجنی تم ابھی چلی جاؤ۔"

سجنی بولی:۔ "اچھا ہے بابو، کب تک اکیلے رہو گے!"

اِل نے محسوس کیا جیسے سجنی نے اُسکے دل کو پکڑ کر مسل دیا۔ اِل نے سجنی کی طرف دیکھا، سجنی کمرے سے باہر چلی گئی اور اِل سر جھکائے سوچنے لگا۔ بیاہ تو ہو رہا ہے مگر سجنی کو کیا؟ اگر بیاہ نہ بھی ہو تو سجنی کو کیا فائدہ؟ پھر اُسکے دماغ میں تیزی سے ایک خیال پیدا ہوا، کہیں سجنی نے بھی تو اُسکے لئے اپنے دل میں کمزوری پیدا نہیں کر لی۔ اِل نے بار بار اپنے دل کو ٹٹولا تھا۔ اُسکے دل کا ایک کونا سجنی کے لئے کمزور تھا۔ اُس نے بار بار سوچا تھا آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیوں؟ اُس نے یہ تو ضرور سوچا تھا کہ سجنی کی موجودگی سے اس کا دل بہل جائے گا۔ اور کبھی کبھی اُسے دیکھ کر اُس کے دل میں گدگدی بھی پیدا ہوئی تھی اور سجنی اتنی سیدھی تھی کہ بے سمجھے اس سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے ہی دن اس نے سر میں تیل ڈالا تھا۔ اِل نے اُسے یہ کام کرنے سے منع کر دیا تھا، پھر بھی اُس نے کئی بار سر میں تیل ڈالنے کو کہا، اِل ہی نے اجازت نہیں دی۔ اور وہ بھی اسلئے نہیں کہ اِل سر میں تیل ڈالنا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ سمجھ بوجھ کر کہ کہیں بات آگے نہ بڑھ جائے۔ یوں جب منگو بیماری سے اچھا ہوا تھا اور سجنی اپنے گھر چلی گئی تھی تو اِل نے سارے گھر کو اُداس اُداس سا محسوس کیا تھا، اور اُس نے منگو سے کہا تھا کہ اُسے بلا لائے۔ اِل کو سجنی کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ وہ کتنی لگن سے اُس کا کام کرتی تھی۔ اور ہر کام بڑی خوشی سے۔ کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اُسے یاد آیا کئی بار اس نے دیکھا تھا وہ پلنگ پر لیٹا ہوتا اور سجنی چائے لے کر آتی تو جب تک وہ آنکھیں نہ کھول دیتا سجنی اُس کے چہرے کو تکتی رہتی۔ اور ایک رات جب اِل کے سر میں درد تھا تو سجنی رات بھر ٹھہر گئی۔

اور جاگتی رہی۔ پھر اُسے یاد آیا، ایک دن وہ آنکھیں بند کئے پڑا تھا سجنی آئی، اُس نے سمجھا کہ وہ سو رہا ہے، اور وہ پاؤں کے پاس بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچتی رہی اور جب اُس نے آنکھیں کھول دیں تو سجنی گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور اُسکا چہرہ پیلا پڑ گیا جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اور امل نے صرف اُس کو وہاں سے ہٹانے کے لئے کہا تھا۔ "جاؤ جلدی سے چائے لے آؤ" اور وہ چلی گئی تھی۔ امل سمجھتا تھا کہ جو کچھ اُس نے مذاق کے طور پر سوچا تھا وہ سچ بن کر سامنے آ تا جا رہا تھا اور وہ بھی پریشان تھا، اُس نے کئی بار سوچا تھا کہ اس اُلجھن کو ختم کردے۔ لیکن اس میں یہ ہمت بھی نہیں تھی کہ سجنی کو جواب دے دے۔

سوچتے سوچتے امل کا دل بھر آیا۔ آخر اس لڑکی کو رکھا ہی کیوں؟ اور رکھا بھی تھا تو اسے اتنا آگے کیوں بڑھنے دیا۔ یہ مذاق تو ہر لحاظ سے خطرناک تھا۔ اب جو اُس نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اور سب سے بڑی اُلجھن یہ تھی کہ خود وہ اپنے دل کے اندر کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ دو دن پہلے نرملا کا خط آیا تھا اور اُس نے لکھا تھا کہ اُسکے باپ نے ایک نہیں، دو دو ڈاکٹر فیس دے کر رانچی بھیجے تھے اور دونوں اُسے دیکھ کر آئے اور پربھات بابو کو بتایا کہ ٹی بی کا شک غلط ہے اور اب وہ مطمئن ہوگئے تھے اور انھوں نے سرت بابو کو خط لکھ دیا تھا کہ شُبھ لگن دیکھ کر بیاہ کی تاریخ مقرر کرلیں۔ اُسکی ماں نے خط لکھ کر بلایا تھا اور بھاوج نے ساری باتیں تفصیل کے ساتھ لکھ بھیجی تھیں اور وہ خود بھی خوش تھا کہ اب نرملا سے ملے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال دل میں کانٹا بنکر چبھتا رہتا تھا کہ سجنی سے چھوٹ جائے گا اور اسکے بعد کیا دنیا میں کوئی دوسرا اپنے آپکو اس طرح بھول کر اس کی خدمت کرے گا۔ اسکا جواب ہر وقت "نہیں" ملتا۔

سجنی چلی گئی، اور وہ یہی باتیں سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اُس کے سر میں درد

سا ہونے لگا۔ اُس نے سونے کی کوشش کی مگر نیند بھی نہیں آئی تو پھر وہ اُٹھ بیٹھا
اور سجنی کو آواز دی۔

"سجنی! چائے لے آو۔"

اور اُس نے سوچا کہ جو بھی ہو سجنی چائے لیکر آئے گی تو دل کھول کر اُس سے باتیں
کرے گا۔ اپنا دل کھول کر اُسکے سامنے رکھ دے گا اور کہے گا کہ وہ بھی اپنا دل کھول کر
رکھ دے۔ اور اسکے بعد سوچے گا کہ کونسی ایسی راہ نکل سکتی ہے کہ وہ بھی خوش رہے اور
سجنی بھی۔ اور وہ سجنی کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر تھوڑی دیر میں مہنگو چائے کی ٹرے
لے کر آیا، اور چھوٹی سی میز پر ٹرے رکھ کر پیالی میں چائے ڈالنے لگا۔ امل سے ضبط نہ
ہوسکا اور وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ "اور سجنی کہاں ہے؟"

مہنگو نے کہا۔ "اُس کا جی خراب ہے وہ گھر چلی گئی ہے اور آج نہیں آئیگی۔"

امل کو جھٹکا سا لگا اور وہ بولا۔ "کیا طبیعت خراب ہے؟"

مہنگو نے چمچے سے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ نہیں بولی۔ کہہ گئی کہ اُسکا جی اچھا نہیں اور وہ نہیں آئے گی۔"

امل چپ ہوگیا۔ چائے کی پیالی اُس نے اُٹھائی اور ایک گھونٹ پی کر رکھ دی۔
اُسے ایسا معلوم ہوا کہ چائے نہیں نیم کا عرق ہے۔ بڑی بے دلی سے اُس نے کہا۔ "مہنگو
لے جاؤ۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔"

مہنگو امل کا منہ دیکھنے لگا۔ امل بولا۔ "لے جاؤ۔ میں نہیں پیوں گا۔ منہ کا مزہ خراب
ہو رہا ہے جی اچھا نہیں۔"

مہنگو نے چپ چاپ ٹرے اُٹھائی اور چلا گیا، امل نڈھال سا ہو کر مسہری پر لیٹ
گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مہنگو پھر آیا تو امل نے کہا۔ "میرا کھانا مت پکانا۔ رات کو کھانا
نہیں کھاؤں گا۔"

اُس دن شام کے وقت امل کمرے سے باہر نہیں نکلا اور سوچتا رہا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ سوچتے سوچتے اُسکے سر میں درد ہونے لگا لیکن کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر سجنی ہوتی تو اس وقت سر میں تیل ڈالنے کو کہتا۔ مگر سجنی تو جاچکی تھی۔ اس نے مہنگو کو پکارا اور جب وہ آگیا تو اُس سے بولا۔ کہ سجنی کو بلا لائے، مہنگو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکر بولا "سجنی بیمار ہے، اُس کو بہت تیز بخار ہے"۔

امل کا دل دھک سے ہو گیا، اور وہ بولا۔ "مہنگو صبح اُٹھ کر سامان درست کرنا ہم سب کل شام کی گاڑی سے کلکتہ چلیں گے"۔

مہنگو خوش بھی ہوا اور اُسے حیرت بھی ہوئی۔ پہلے پروگرام کے مطابق اُس کے کلکتہ جانے میں ابھی ایک ہفتہ کی دیر تھی۔ یکایک اس نے پروگرام بدل دیا تو مہنگو کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں، امل نے اُس سے کہا ذرا سر میں تیل ڈال دے، اور مہنگو تیل ڈالنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد امل کو نیند آگئی۔

صبح کے وقت جب مہنگو چائے لے کر آیا تو امل عادت کے خلاف مسہری پر سر جھکائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا اور معلوم ہو رہا تھا کہ دیر سے جاگ رہا تھا۔ چائے ڈالکر پیالی اُسکی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بابو سامان درست کیا جائے؟"

"ہاں۔ آج چلنا چاہیئے"۔

مہنگو نے کہا۔ "اب رانچی میں جی نہیں لگتا"۔

"ہاں بہت دن ہو گئے"۔

جب امل نے چائے کی دوسری پیالی بھی ختم کرلی تو مہنگو چائے کی ٹرے لے کر چلا گیا۔ ابھی سورج نکل ہی رہا تھا، امل نے سوچا سو جانا چاہیئے۔ اگر ایک دو گھنٹہ سو جائے گا تو طبیعت ہلکی ہو جائے گی لیکن پھر بھی اُسے نیند نہ آئی۔ اور وہ سو جانے کی کوشش میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اُس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسی دن

رانچی سے کلکتہ چلا جائے گا۔ مگر اس خیال سے اُسے بے چینی ہو رہی تھی کہ جانے سے پہلے سجنی سے ملاقات نہیں ہو سکے گی اور وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے سجنی کو ایک بار دیکھ لے اور اُسے سمجھائے، لیکن سجنی اب نہیں آئے گی، اس کا اسے یقین تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سجنی کی طبیعت خراب کیوں ہوئی ہے، اسے سچ مچ بیماری نہ تھی۔ بلکہ رنج سے اُسے بخار آگیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ سجنی اُس سے کس قدر قریب آنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور وہ ہر بار اُسے دور ہٹانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ انل کو محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے سجنی پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ کم سے کم یہ تو جاننے کی کوشش کرتا کہ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ لیکن اس میں جاننے کی بات بھی کیا تھی، آخر وہ کیوں جانتا۔ اُس نے بہت سوچا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس نے ایک بار کے سوا کبھی سجنی کو بڑھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اگر اُس نے کبھی سوچا تھا کہ اس سے دل چسپی لی جائے تو وہ صرف اپنی حد تک بغیر کام کے اُس نے سجنی کو کبھی نہ بلایا تھا، اور نہ اُس سے کام کے علاوہ کبھی کوئی بات ہی کی تھی۔ اس کے دل اور دماغ پر نرملا چھائی ہوئی تھی۔ اور کسی دوسرے کے لئے اس میں جگہ پیدا ہونے کا سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس کے خیال کا دھارا بدل گیا اور اُس نے سجنی کے لئے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کی۔

وہ نہانے کے لئے بستر سے اُٹھا ہی تھا کہ باہر سائبان میں اسے کوئی سایہ سا ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر سجنی یکایک سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "رات تم نے کھانا نہیں کھایا بابو"

انل سجنی کو دیکھ کر گھبرا سا گیا، اور پھر مسہری پر بیٹھ گیا۔ سجنی بولی۔ "مہنگو کہہ رہا تھا کہ شام کو چائے بھی نہیں پی۔ کھانا بھی نہیں کھایا، اور صبح کو بھی...."

"تم کیوں آئیں، بیمار ہو، تم کو آرام کرنا چاہیے" انل بولا۔

سجنی نے کہا۔"میری فکر مت کرو بابو۔ میں اچھی ہو جاؤں گی زیادہ بیمار نہیں ہوں"۔
"مگر بیماری بڑھ جاتی ہے، تم کو خیال رکھنا چاہیئے۔"
"میں آئی ہوں کہ چائے بنا کر لاؤں، اور کھانا خود پکاؤں....."
امل نے بیچ ہی میں روک دیا اور بولا"سجنی۔ تم جاکر آرام کرو، ورنہ زیادہ بیمار ہو جاؤگی۔"
سجنی بولی:"میری فکر مت کرو بابو۔ مگر تم بھوکے رہے"۔
سجنی کا چہرہ اور بھی پیلا پڑ گیا۔
امل نے کہا۔"نہیں نہیں تم تکلیف مت کرو"۔
سجنی بولی۔"آج ہی جا رہے ہو بابو؟"
"ہاں"
"اتنی جلدی؟"
"ہاں اب جانا ضروری ہے"۔
"یاد رکھوگے بابو۔ یا بھول جاؤگے جاکر....."
معلوم ہوا جیسے امل کی رگوں میں برف کا پانی دوڑنے لگا۔ وہ گھبرا کر سجنی کا چہرہ دیکھنے لگا، اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ امل نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اُس کی زبان ہل بھی نہ سکی۔ اور سجنی کا منہ تکتا رہا۔
سجنی بولی۔"میں کبھی تمھیں نہ بھولوں گی، روز یاد کروں گی"۔
اُسکی آواز بیٹھ گئی، اس سے آگے ایک لفظ نہ بول سکی۔ وہ واپس جانے کے لئے مُڑی، مگر لڑکھڑا کر گرنے لگی۔ امل کے بدن میں نہ جانے اچانک اتنی پھُرتی کہاں سے آگئی، اُچھل کر اُس نے سجنی کو بچا لیا۔ سجنی امل کے ہاتھوں میں آگئی اُس کا سر امل کے سینے پر تھا۔ کمزور آواز میں بولی۔"مجھے گرنے دو بابو، مجھے جانے دو"۔

امل نے سجنی کو اُٹھا کر مسہری پر لٹا دیا اور بولا: "ہوش کرو سجنی۔"
سجنی نے آنکھیں کھول دیں۔ امل کو دیکھ کر بولی: "مجھے کیوں بچایا بابو، میں کون ہوں تمھاری....."
امل ایک لفظ نہ بول سکا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور گلا رُندھ کر رہگیا۔
"تم کیوں روتے ہو بابو....." امل کچھ بھی نہ بول سکا۔ سجنی کو غور سے تکتا رہا۔ یکایک اُس پر جھک پڑا اور اسکے سینے پر سر رکھ کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سجنی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اُسے سینے سے لگا کر بولی: "مرد ہو کر روتے ہو بابو۔ رونا تو عورتوں کا کام ہے۔"
امل نے پوری طاقت سے سجنی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا: "سجنی میں نہیں جا رہا ہوں، میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔"
سجنی نے آہستہ آہستہ امل کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور کمرے میں دونوں کی سسکیوں کی آواز پھیلنے لگی۔
سجنی بولی: "نہیں بابو تم جاؤ۔ تمھارا کوئی انتظار کر رہی ہے۔ بیاہ کر لو، خوشی خوشی زندگی گزارو، میں تمھیں خوش دیکھ کر خوش ہو لوں گی....." امل نے سجنی کو اور کھینچ لیا اور اُسکے گال پر ہونٹ رکھ کر بولا: "سجنی میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں سے جا کر خوش نہیں رہ سکتا، میرے دل میں کانٹا چبھ گیا ہے وہ سدا کھٹکتا رہے گا....."
سجنی ذرا الگ ہو گئی اور بولی۔ "بابو کانٹے کو نکال کر پھینک دو، اور خوش رہو، تم تو پھر آؤ گے بابو۔ پھر....."
سجنی ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ امل بولا: "میں نہیں جاؤنگا۔ میں نہیں جاؤں گا۔"
وہ سجنی کو مسہری پر چھوڑ کر جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور کمرہ بند کر کے بیٹھ گیا۔

غیاث احمد گدی

کالے شاہ

جب کبھی مجھے مجو بھائی یاد آتے ہیں تو ان کی آنکھوں کی وہ چمک بھی یاد آجاتی ہے جو میں نے ان میں اماں کی گود میں دم توڑتے وقت دیکھی تھی۔ ابھی کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے مجو بھائی کی موت کو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے صبح الگنی پر جو قمیص میں نے سوکھنے کو ٹانگی تھی وہ ابھی اچھی طرح خشک بھی نہیں ہونے پائی ہے۔ اور ہوا کے جھونکوں سے اس طرح کانپ رہی ہے جیسے صبح میں نے دیکھی تھی ...... مگر گھر والوں نے زندگی کے چھوٹے بڑے جھمیلوں میں پڑکر مجو بھائی کو یوں فراموش کردیا گویا مجو بھائی نام کا کوئی متنفس تھا ہی نہیں ہمارے خاندان میں۔ ذرا غور کرو تو مجو بھائی کی شیروانی کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک اماں کے گینڈرے میں موجود ہے ——— مجو بھائی کے جسم کا ایک ٹکڑا معلوم پڑتا ہے۔ اسی طرح مڑا سڑا بدرنگ جیسے بار بار دھونے کی غرض سے پتھروں پر پٹکتے رہنے کے سبب پھیکا اور جگہ جگہ سے مسک گیا تھا۔ مجو بھائی کا جسم بھی کچھ اس طرح سوکھا ٹٹانہ تھا۔ سانولی جلد ملگجی ہوگئی تھی۔ اور ہاتھ کی رگیں ایسی پھول آئی تھیں گویا بجلی کا تار لپیٹ لیا ہو مجو بھائی نے اپنے ہاتھوں پر، گال پچکے پچکے اور آنکھیں بڑی بڑی سرخ اور عجیب افسردہ سی، ان میں ایک طرح کی بے چارگی اور شاید ندامت کا احساس ہر وقت جھلکتا رہتا۔ پھر اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے چلتے کس طرح تھے، ٹھہر ٹھہر کر گویا ان کی سوکھی مریل ٹانگیں جو بمشکل آدھ سیر بھی نہ ہونگی من من بھر کی ہوں۔ گھر بھر میں کسی سے کچھ نہیں بولتے۔ آپ بیٹھے ہوں، ہنس رہے ہوں، یا چیخ چیخ کر رو رہے ہوں، آپ کے پاس سے گردن جھکائے یوں گزر جائیں گے گویا اس دنیا میں موجود ہی نہیں، کوئی موڈ میں آکر کبھی ان سے مذاق کر بیٹھتا تو ہنس دیتے۔ بڑے بھیا کسی بات پر ڈانٹتے یا بھابی جھڑک دیتیں تو دھیرے سے

مسکرا دیتے اور چپ چاپ وہاں سے ٹل جاتے۔ کبھی کبھی بڑی خواہش ہوتی کہ مجو بھائی ہم لوگوں میں بیٹھتے۔ ہنستے، جس طرح بڑے بھیا کرتے ہیں۔ بڑے بھیا کی طرح ہماری گڑیا ہی چرالیں، ہمارے بال ہی نوچ ڈالیں یا خفا ہی ہولیں...... مگر یہ نہیں ہمارے بھیا کس مٹی کے بنے تھے؟ کس خیالی دنیا میں رہتے تھے کہ کبھی ہماری طرف پلٹ کر دیکھتے نہیں۔ گھر میں ہوتے تو اپنے کمرے میں پڑے چارپائی پر اونگھا کرتے، باہر نکلتے تو کالے شاہ کے مزار کے کچے فرش پر بیٹھے، پیپل کے پتوں کو گھورا کرتے اور کنکری اٹھا اٹھا کر پتوں کا نشانہ لگایا کرتے۔

اماں کہتی تھیں، اسی لئے کالے شاہ کے سائے نے اُسے دبوچا تھا! کالے شاہ کون تھا اور اس برسوں پہلے مرے ہوئے کالے شاہ کے سائے نے کس طرح مجو بھائی کو دبوچا تھا۔ اس وقت میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ البتہ ایک بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا مجو بھائی کو جب ان پر کالے شاہ آئے ہوئے تھے، بھیا زور زور سے گردن کو جھٹکے دے رہے تھے اور منھ سے پف پف کی آواز نکال رہے تھے۔ اور لوگ ان سے منتیں کر رہے تھے کہ مجو بھائی کو چھوڑ دیں، ان کی خطائیں معاف فرمائیں......!

اماں کہتی تھیں کہ اسی کالے شاہ نے مجو بھائی کا سارا خون چوس لیا تھا اور ان کے جسم پر ماس نہیں چڑھنے دیتا تھا۔ وہی کالے شاہ اس کے ذہن پر سوار رہتا ہے جو مجو بھائی کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ مجو بھائی کی یہ عادت پہلے نہ تھی۔ ہاں اُن دنوں اتنا زیادہ کھوئے کھوئے نہیں رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہنس لیتے تھے۔ بول لیتے تھے۔ کسی شہر سے نوکری کی تلاش کے بعد مایوس آتے کچھ دیر افسردہ دکھائی دیتے، مگر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد پھر ٹھیک ٹھاک ہو جاتے اور اماں کے قریب فرش پر بیٹھ کر لمبی لمبی باتیں کرنے لگتے کہ نوکری ملتے ہی ایک گھر بنواؤں گا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا اچھا سا پلنگ خریدوں گا، تمھیں بٹھا کر تمھاری بہو سے کہوں گا کہ اماں کی دن رات خدمت کیا کرو! خوب اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلا۔ یہ بڑے بھیا تو آدھی روٹی دیتے ہیں تو طرح طرح کی باتیں سناتے ہیں کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے میری اماں کو یہاں.... !!

اماں اکثر تو چپ رہتیں۔ قمیص پر بخیہ کرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھتیں پھر منھ بنا کر سلائی میں مصروف ہو جاتیں گویا بھیا زمانے بھر کے خراب آدمی ہوں۔ بڑے بھیا سے زیادہ

تکلیف دیتے ہوں انھیں مگر کبھی کبھی جب ان کا موڈ ٹھیک رہتا تو آہستہ سے ہنس دیتیں۔

"پر کہاں ہے دُلہن، ذرا دیکھوں تو سہی؟"

"دُلہن! ارے اماں لے آؤں گا ایک دن اٹھا کر کہیں سے دیکھ لینا!" بھیا بڑے جوش سے بولتے۔

"مگر کب لے آئے گا کہیں سے، کسی دن؟"

"بس بس...... ملازمت ملتے ہی!" یہاں پہنچ کر بھیا کی آنکھیں خلا کی طرف اٹھ جاتیں اور ان کا چہرہ یوں پھیکا اور مدھم ہو جاتا گویا باہر کی دھوپ اچانک ڈوب گئی ہو۔ اور کمرے میں ذرا اُجالا کم ہو گیا ہے۔

پتہ نہیں اس ملازمت کے لفظ میں کیا اداسی تھی کہ لمحہ بھر میں مجو بھائی کی ساری جیتی افسردگی میں بدل جاتی اور مجو بھائی آہستہ سے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ وہ باہر چلے جاتے تو اماں سُوئی میں پرونے والے دھاگے کے سرون کو دانتوں سے کھٹکتے ہوئے زور سے تھوکتیں اور کسی قدر جلے ہوئے لہجے میں مجو بھائی کو کوستیں ـــ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا......!

اماں کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ دشمن اناج کا کیوں کہتیں؟ مجو بھائی کی خوراک تو بہت کم تھی، وہ کبھی ہفتے میں دو ایک دن ناغہ ہی کر جاتے۔ کسی دن بڑے بھیا سے جھگڑا ہو جاتا، بھابی جھڑک دیتیں اور ان کی بے کاری اور مفت خوری پر ڈھکے چھپے لفظوں میں طعنے دینے لگتیں...... اور مجو بھائی رنجیدہ ہو کر یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر چلے جاتے کہ مجھے نوکری ملے گی، تب ہی کچھ کھاؤں گا اس گھر میں، مگر نوکری کہاں ملتی تھی، وہ تو کہانیوں والی سبز پری بن گئی تھی کہ مجو بھائی جس قدر اس کی تلاش کرتے اتنا ہی وہ ان سے الگ تھلگ چھپی رہتی......!

کیا کیا جتن نہیں کئے مجو بھائی نے ملازمت کے لئے، مجھ سے کیا پوشیدہ تھا۔ شہزادہ گلفام کی طرح پاگل ہو گئے تھے انٹرنس پاس کرنے کے بعد چھ سال تک انھوں نے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی، کتنی سفارشیں حاصل کیں، کتنی کتنی خوشامد سے بڑے بھیا سے سفر خرچ کے لئے روپئے حاصل کئے۔ کتنی منت سے میرے بتاشے لئے تھے مجھ سے، جو کبھی واپس نہ ہوئے۔ کہنے لگے "منو! تو میری چھوٹی

بہن نہیں ـــــــ بڑی بہن ہے، تو میری مالکن اور میں تیرا غلام ہوں......!" اب سوچتی ہوں تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، انھوں نے میرا سر دبایا تھا، میری چلیں تک صاف کرنے لگے تھے مارے خوشامد کے۔ کہنے لگے "بنو تو زیور دے چکی ہے، اس بار کلکتہ والی نوکری ضرور مل جائے گی۔ انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا ہوں"...... بے طرح گھگھیاہٹ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے چپکے سے بتانے نکال کر تھما دیئے۔ مگر مجو بھائی بتانے پاکر پتہ نہیں کیوں خوش نہ ہوئے۔ بتانے لیکر اسے ایک ٹک، دیکھتے رہے۔ پھر اچانک لپک کر مجھے اتنے زور سے بھینچ لیا کہ میں سہم گئی۔ "تو نے بڑے موقع پر کام دیا میری ننھی...... ! تو نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا بنو......!!"

مجھے لگا ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ جب وہ الگ ہوئے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظر آئیں۔

میں تعجب سے انھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔ کیسے عجیب ہیں مجو بھائی! کہاں تو بتانے کے لئے یوں بے طرح گھگھیا رہے تھے، کہاں بتانا ملنے کے بعد خوش ہونے کے بجائے رونے لگے۔ میں جانتی کہ مجو بھائی بتانا پاکر رونے لگیں گے تو ہرگز نہ دیتی انھیں۔

پھر سات دنوں کے بعد کلکتہ سے واپس آئے تو اسی طرح بے نیل زمرام گردن جھکائے جھنکائے مجھے بچے سے ـــــ گھر کے اور لوگوں نے تو کچھ بھی نہ پوچھا، اپنے کاموں میں مصروف ایک ذرا گردن اٹھا کر دیکھا پھر جٹ گئے انھیں کاموں میں۔ مجو بھائی نے چپ چاپ اپنے کمرے میں جاکر، ٹوپی سر سے اتار کر میز پر پھینکی، جو میز کے بجائے فرش پر گری، پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ پھر منھ سے کچھ کہے بغیر چارپائی پر پڑ رہے، جیسے پیدل ہی تو کلکتہ سے چل کر آرہے ہوں...... میں نے پوچھا، تب بھی کچھ نہ بولے...... تھوڑی دیر بعد میں نے پھر پوچھا تو اس بار ایک دم پھپک پڑے

"تو کیوں مری جاتی ہے! تیرے بتانے چھڑوا دوں گا، لے کر مر نہ جاؤں گا تیری چیز!!!"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ لو بھئی! جن کے لئے چوری کر دو وہی کہے چور۔ واہ رے دنیا۔ اللہ گواہ ہے جو میرے دل میں ذرا بھی زیور کی بات رہی ہو۔ میں تو ہمدردی سے پوچھ رہی تھی کہ بیچارے نے اتنے ارمانوں کی بھیڑ لگا رکھی ہے جس ملازمت کے نام وہ انھیں ملی بھی یا نہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔

مجو بھائی پر۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ بڑے بھیا، بھابی اور اماں جو مجو بھائی سے اتنا برا سلوک کرتے ہیں، بات بات پر جھڑکیاں اور طعنے سنائے جاتے ہیں تو وہ دراصل میں بھی ایسے ہی۔ سچ مچ مجو بھائی نکمے ہیں زمانے بھر کے...... ٹھیک کرتی ہیں بھابی جو ایک گھر میں دو ہانڈیاں کرتی ہیں اور بڑے بھیا کے مقابلے میں روکھا سوکھا کھانا لا پٹختی ہیں ان کے سامنے......

اس دن مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے آگا سوچا نہ پیچھا اسی وقت جا کر اماں سے زیور والی بات کہدی۔ اماں نے سنا تو ایسی بن گئیں جیسے انھیں غش آگیا ہو، ہوش میں آئیں تو سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا۔ اور تڑ اتڑ دونوں ہاتھوں سے مجھے پیٹنے لگیں۔ پھر سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ اماں اپنے کمرے سے اُٹھ کر مجو بھائی کی چارپائی کے نیچے فرش پر دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔ اور چیخ چیخ کر تقاضے کرنے لگیں کہ جس طرح بھی ہو وہ زیور لاؤ۔ سیکڑوں گالیاں دے ڈالیں اماں نے انھیں۔ یہی بات تو اماں کی پسند نہیں مجھے۔ ذرا دیر میں بھوت سوار ہو جاتا ہے ان پر۔ اور اس وقت وہ اتنا بھی نہیں غور کرتیں کہ وہ کیا بول رہی ہیں، کیسے بول رہی ہیں........!

شور و غل سُن کر اپنے کمرے سے بھابی اور بڑے بھیا بھی آدھمکے اور مجو بھائی کی ایسی تھڑی تھڑی اڑا ایسی فضیحت ہوئی کہ میں خود شرمندہ ہو گئی اپنی حرکت پر اور مجو بھائی پر رحم آنے لگا۔ بڑے بھیا، بھابی اور اماں انھیں طرح طرح سے کوس رہی تھیں، گھر کے بچے سے لیکر محلے کی دو ایک عورتیں بھی آدھمکی تھیں، اور سب کی سب مجو بھائی کو ملامت آمیز نظروں سے تک رہی تھیں۔ گویا مجو بھائی نے زیور مجھ سے مانگ کر نہیں چوری کر کے گروی رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجو بھائی کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ چاروں طرف سے پھٹکار پڑ رہی تھی۔ اور وہ بیوقوفوں کی طرح چاروں طرف کبھی اماں کو، کبھی بھابی اور بڑے بھیا کو ہونق کی طرح دیکھ رہے تھے۔ وہ سفر سے آئے تھے۔ کسی نے ایک گلاس پانی تک کو نہیں پوچھا تھا بلکہ اور لوگ ان کو ذلیل کر رہے تھے۔ مجو بھائی ساری باتیں بے حسی سے سنتے رہے۔ پھر دفعتاً چہرے پر ہاتھ رکھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

مجو بھائی کی وہ بے چارگی اور رونے کا وہ انداز میں شاید کوشش کرنے پر بھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔ ایسا معلوم پڑ رہا تھا گویا وہ برسوں سے رونے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔

پتہ نہیں ان کے سیدھے سادے دل میں کتنے زخم لگے تھے۔ آنسوؤں اور آہوں کی جتنی باڑھیں روکے ہوئے تھے وہ سب چند منٹوں کے گریہ میں بہنے لگیں۔ مجو بھائی کے رونے کا یہ انداز دیکھ کر میری بھی آنکھ بھر آئی۔ جسے کمرے سے نکل کر میں نے آہستہ سے ڈوپٹہ سے خشک کر لیا۔

رات بھر میں بہت مضطرب رہی۔ مجو بھائی پر جو زیادتی ہوئی تھی، اس کی ذمہ دار دراصل میں تھی۔ زیور تو میں نے دے ہی دیا تھا۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ جب تک مجو بھائی کی ملازمت نہ مل جائے وہ نہیں چھڑا سکیں گے۔ کیا ہوتا اگر اس دن اماں سے نہ بتاتی زیور والی بات ——— ہر گھر میں بڑے بھائی بہنوں پر ناراض ہوتے ہیں، ڈانٹتے بلکہ مارتے پیٹتے تک ہیں۔ اس کی شکایت کبھی نہیں کی کسی نے کسی سے۔ مجو بھائی نے تو کبھی ترچھی نظر سے مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس دن میں ہی دو آنسو بہا کر رہ جاتی تو کیا بگڑ جاتا میرا۔ رات بھر میں بستر پر کروٹ بدلتی رہی۔ جیسے کوئی بھاری گناہ سرزد ہو گیا ہو مجھ سے۔ دوسرے دن دوپہر کو جب مجو بھائی اپنے کمرے میں لیٹے چھت کی کڑیاں گن رہے تھے، میں ان کی چارپائی کے قریب جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر اُٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے زبی؟" ان کی آواز کچھ بدلی بدلی سی تھی ——— میں ایک لفظ بولے بغیر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت میری آنکھوں سے جانے کہاں سے ڈھیروں آنسو بہہ آئے اور میں مجو بھائی کے شانے پر سر رکھ کر بے اختیار سسک سسک کر رونے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ "تو کیوں رو رہی ہے پگلی! میں کوئی ناراض تھوڑا ہی ہوا ہوں، مجھے تو کسی سے شکایت نہیں بنو! کسی سے کچھ نہیں مجھے ——— مجھے تو اپنے آپ سے گلہ ہے۔ اپنے آپ سے ....!!"

پھر پتہ نہیں بہت دیر تک وہ کیا کہتے رہے۔ پھر انھوں نے میرے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھ ڈالا اور ہنس پڑے۔ عجیب سی مردہ ہنسی ——— "جاؤ بنو! کھیلو پگلی ....!! پتہ نہیں ان آنسوؤں کی تمھیں کب ضرورت پڑے۔ انھیں اس طرح برباد کر دو گی تو کل کے دن اپنے مجو بھائی کی موت پر کہاں سے مانگتی پھرو گی۔ حمق ......!"

میں نے سوچا تھا، مجو بھائی ہمیں معاف کر دیں گے، بڑا دل ہے ان کا۔ مگر کتنی بڑی سزا دی تھی انھوں نے مجھے اس دن، کیسے بُرے وقت میں کہے تھے یہ الفاظ انھوں نے کہ آج بھی جب میں سوچتی ہوں تو میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی ہے اور میں اکیلے کمرے میں آنچل سے چہرہ ڈھانپ کر پہروں ہچکیاں لے لے کر رویا کرتی ہوں۔ مجو بھائی تم کس قدر اندھیرے میں ڈوب گئے، مجو بھائی ......!

مجو بھائی مجھے اندر ہی اندر کتنا چاہتے تھے یہ کوئی کیا جانے۔ وہ کیک والی بات بھولتی نہیں۔ زیور والے واقعہ کے تیسرے دن کی بات ہے۔ بھابی کے بھائی اُن کے میکے سے آئے ہوئے تھے، سوغات میں ایک بڑا سا بادام اور چینی لگا کیک لیتے آئے تھے۔ بھابی نے تو پتہ تک چلنے نہ دیا تھا۔ وہ تو میں نے کھڑکی سے مکان کے پچھواڑے سنتو پان والے کی دوکان کے پاس بھابی کے بڑے بیٹے شکور کو کیک کھاتے ہوئے دیکھ لیا۔ شکور کو بلایا تو اس نے تُلا تُلا کر کہا کہ ماموں جان لائے تھے، بڑا سا کیک تھا، کشمش بھرا ہوا .... یہ بات تو چھپی نہیں تھی کہ بھابی کس دل کی انسان ہیں، پھر بھی مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اماں اور مجو بھائی تو دور رہے، گھر بھر میں چھوٹی لڑکی میں تھی اکیلی نند۔ انھوں نے جھوٹے منہ پوچھا تک نہیں مجھ سے...... مجھ سے رہا نہیں گیا۔ دوپہر تک میں نے ان سے ذکر کر دیا۔ اس پر وہ خفا ہو پڑیں کہ میں بہت چٹوری ہوتی جا رہی ہوں۔ انھوں نے کچھ ایسے لفظوں میں مجھے ڈانٹ پلائی کہ میں ضبط نہ کر سکی اور میں نے بھی الٹی سیدھی کہہ دی کہ اس گھر میں ایک ایک چیز کو تو آدمی ترستا ہی رہتا ہے، کون یہاں مٹھائیوں کے دونے لا کر دیتا رہتا ہے۔ عید، بقر عید میں چار آنے کی ریوڑیاں آتی نہیں، چٹورا نہیں ہوگا آدمی تو کھانا کہاں سے ہوگا ـــــ میں غصے میں بولے جا رہی تھی کہ عین اسی وقت مجو بھائی اپنے کمرے سے اٹھے اور خاموشی سے گردن جھکائے، ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب لئے باہر نکل گئے۔ شام کو لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں ایک کیک تھا جسے انھوں نے چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اماں وہیں تھیں انھوں نے پلٹ کر کچھ ایسی نظروں سے مجو بھائی کی طرف دیکھا گویا وہ گھر کا کوئی سامان چرا کر یہ کیک لائے ہوں۔

"یہ کہاں سے اٹھالائے ہو؟ کہیں کوئی برتن تو نہیں بیچدیا۔ ایسی محبت ہے بہن کی تو کہیں سے کماکر لائے ہوتے!"

مجو بھائی کا چہرہ ایک منٹ میں سیاہ فام ہوگیا!

اماں کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ وہ کانپنے سے لگے اور گھور کر اماں کو یوں دیکھا کہ میں تو ڈر گئی، کہیں مار نہ بیٹھیں اماں کو وہ ـــ اماں بھی سہم گئیں ـــ وہ آگے بڑھے یوں گویا اب مار بیٹھیں گے اماں کو، مگر پھر رک گئے .... اور کچھ کہے بغیر گھر سے باہر کالے شاہ کے مزار کی سمت چلے گئے۔

پھر اس دن سے مجو بھائی جو کبھی کبھار عجیب سی ہنسی ہنس دیتے، وہ بھی چھن گئی اُن سے۔ زیادہ بولتے تو پہلے بھی نہ تھے۔ اب تو ایسے چپ چاپ رہنے لگے کہ کھانا کھاتے وقت اگر دال یا سبزی گھٹ گئی تو منھ کھول کر مانگتے تک نہ تھے ـــ جو ہوتا اتنا ہی کھا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور نہیں تو پہلے ہر صبح کو ڈاکخانہ ضرور جاتے تھے کہ شاید کوئی خط، کوئی انٹرویو لیٹر آیا ہو کہیں سے ـــ مگر اب اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ بلکہ ان دنوں جو انٹرویو کے خطوط آئے انھیں لفافہ چاک کر کے دیکھا تک نہیں۔

ادھر گھر کے سارے لوگ، حتیٰ کہ اماں نے بھی اس دن کے بعد کبھی یہ تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کہ مجو بھائی بھی متنفس ہیں، اس کنبے میں، ان کے کھانے پینے، کپڑے لتے ...... کسی چیز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی ...... وہ تو میں تھی جو اسکول کے کام سے فرصت نکال کر ان کا تھوڑا بہت کام کر دیا کرتی تھی مگر حیرت اماں پر ہوتی تھی!

اماں کو تو سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ ماں تھیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوتا کہ ایک دن تو میں نے اشاروں اشاروں میں کہہ دیا تھا کہ اماں کیا زمانے کا لہو سفید ہوگیا ہے؟ لیکن اماں نے سمجھا نہیں انھوں نے مجھے ڈانٹا کہ بڑی بوڑھیوں کی طرح باتیں کرتی ہوں۔

مگر اماں کا پیار سویا ہوا تھا۔ سچ کہا کرتی تھیں استانی جی کہ ماں کے دل کو کوئی کیا پہچان سکتا ہے واقعی جب سیکڑوں مصیبتوں کے ساتھ مجو بھائی پر ایک اور مصیبت آپڑی یعنی کالے شاہ کی روح نے

انھیں پکڑ لیا، اس وقت اماں کا پیار دیکھنے کے قابل تھا، پاگل سی ہوگئی تھیں وہ مجو بھائی کی حالت دیکھکر۔ کیا کیا جتن نہیں کئے انھوں نے مجو بھائی کے لئے۔ کتنے پیسے پھونک ڈالے۔ کہاں تو وہ چھوٹے سے تاپنے کے لئے اس درجہ چراغ پا ہوگئی تھیں ایک دن کہ میں سمجھی اماں انسان نہیں کچھ اور ہیں، اور کہاں کتنے گڑے چھپے زیور اُن پر سے اتار کر فقیروں اور پیروں کی نذر کر دیئے۔ کتنے ہی مزاروں کی زیارت کردائی انھوں نے ...... یوں اب تو بڑے بھیا اور بھی ان کا خیال رکھنے لگے تھے۔ مگر میں جانتی ہوں، کہاں تو ساگ اور خشک روٹی دیتے وقت تیوریاں چڑھ جایا کرتی تھیں، کہاں اب طرح طرح کے حلوے کھلائے جا رہے ہیں۔ ڈانٹنا ڈپٹنا تو دور کی بات بھیا بے حد پیار سے پیش آتے، یہ سب مجو بھائی کی محبت کے زیر اثر تھوڑے ہی ہو رہا تھا وہ تو بھابی اور بھیا کو ایک خوف دامن گیر تھا کہ کالے شاہ کا سایہ کہیں انھیں نہ آ چمٹے۔ بھابی کے ایک ایک انداز سے یہ بات صاف ظاہر تھی ...... مجو بھائی کے نزدیک بہت کم جاتیں۔ مجو بھائی کبھی اچھی حالت میں بھی قریب سے گزر جاتے تو یوں چونک اٹھتیں گویا کہ کالے شاہ کے سائے نے انھیں اب دبوچا کہ اب دبوچا۔!

کالے شاہ کے سائے سے تو سبھی ڈرتے تھے تین ماہ قبل ہی محلے والی سکینہ کو کتنا پریشان کیا تھا اس نے جب سے سنا تھا کہ یہ سائے کنواروں کو ڈھونڈا کرتے ہیں۔ میں تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ مجو بھائی پر جب کبھی کالے شاہ کا سایہ آتا، اس روز ان کی اور گھر والوں کی کیفیت دیکھنے کے لائق ہوتی، مجھے تو ان کے قریب جانے بھی نہ دیا جاتا۔ میں خود بھی ڈر کے مارے نہ جاتی تھی۔ ایک روز میں نے کھڑکی سے چھپ کر دیکھا تھا، مجو بھائی آنگن میں چارپائی پر بیٹھے زور زور سے گردن کو جھٹکے دے رہے تھے اور منھ سے پف پف کی آواز نکال رہے تھے۔ ان کی چارپائی کے نزدیک محلے کے کئی بڑے بوڑھے کھڑے عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ عظمت چچا جو بڑے تگڑے جوان ہیں، مجو بھائی کو زور سے تھامے ہوئے تھے اور پہلو میں اماں کھڑی منھ پر آنچل رکھے سسکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بڑی سی پگڑی والے محلے کی مسجد کے امام کو لئے بڑے بھیا آ پہنچے۔ بڑے بھیا اندر سے مچیہ لے آئے۔ مچیہ پر بیٹھتے ہوئے منھ ہی منھ میں امام صاحب کچھ بدبدائے، اور آہستہ آہستہ پڑھتے رہے۔ تھوڑا سا سرسوں کا تیل منگوا دیا گیا۔ امام صاحب نے کچھ پڑھ کر تین بار تیل پر

پھونکیں ماریں اور بڑے بھیا کی طرف کوڑی بڑھا دی کہ مجو بھائی کے دونوں کانوں میں تیل ڈال کر اسے شہادت کی انگلی سے دبا دیں۔ کان میں تیل ڈال کر دباتے ہی مجو بھائی بلبلا اٹھے اور گھٹی ہوئی آواز میں چیخ پڑے۔ "علی علی ...... مرتضیٰ علی ..... علی توڑ دشمن کی نلی"...... بالکل محلے کے کریم الدین پان والے کی لڑکی سکینہ کی طرح، ابھی تین ماہ قبل اس پر کالے شاہ کا سایہ آیا تھا تو اسی طرح وہ گردن کو جھٹکے دے کر علی ...... مرتضیٰ علی ..... کہتی تھی ...... مجو بھائی کی آواز بھی بدلی بدلی معلوم پڑ رہی تھی، وہ زور زور سے چیخ رہے تھے، گرج رہے تھے۔ اور ایسے کہ لوگوں نے مجو بھائی کے گلے سے ایسی آواز سنی تک نہیں تھی کبھی۔ امام صاحب تک مجو بھائی کی آواز سن کر سہم گئے اور بڑی ملائمت اور عقیدت مندانہ لہجے میں بولے "کہیے، فرمائیے، آپ کون ذات شریف ہیں؟ اور اس نادان کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟؟ فرمائیے ہم گنہگار اس وقت آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟؟؟" میں بخوبی دیکھ رہی تھی کہ امام صاحب کی آواز کانپ رہی تھی اور وہ سہمے سہمے لگ رہے تھے۔ پھر جب کالے شاہ کے سائے نے سرخ سرخ آنکھیں نکالیں اور گرج کر پوچھا کہ "کون ہے گستاخ جو میرے جلال سے ٹکر لینا چاہتا ہے تو امام صاحب کی گھگھی بندھ گئی۔

مجو بھائی نے آنکھیں نکال کر چاروں طرف دیکھا پھر گرج کر بولے۔ "میں اس چھوکرے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نالائق نے اپنے دوستوں میں میری کھلی اڑائی ہے ...... کبھی نہیں چھوڑوں گا اسے"...... اتنا سننا تھا کہ اماں کے ضبط کے بندھ ٹوٹ گئے۔ اور وہ بے اختیار ہو کر مجو بھائی کے پیروں پر گر پڑیں۔ اور سر ٹیک ٹیک کر منتیں کرنے لگیں کچھ ایسے انداز سے کہ آس پاس کھڑے لوگوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں ..... مگر کالے شاہ کے سائے کو رحم نہ آیا۔ اس نے پیروں کو جھٹکا دے کر اماں کو الگ کر دیا۔ پھر بہت سی باتیں ہوئیں۔ بڑی دیر تک سارا گھر کالے شاہ کے اشارے پر ناچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد مجو بھائی آپ سے آپ سجدے میں چلے گئے۔ اور سر اٹھایا تو سایہ چلا گیا تھا اور مجو بھائی بدحواسی سے چاروں طرف گھور رہے تھے ...... !

جس دن ایسا ہوتا یعنی کالے شاہ کا سایہ مجو بھائی پر آتا، بڑے بھیا خصوصاً بھابی بڑی سہمی سہمی رہتیں اور رات کے کھانے کے وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز ضرور بنالائیں اور بڑے پیار

سے پنکھا جھل جھل کر مجو بھائی کو کھلاتیں۔

اب مجو بھائی کو تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کالے شاہ کے خوف سے محلے والے تک ان سے بڑی اچھی طرح پیش آنے لگے تھے۔ بلکہ اکثر ان کو دعوتیں بھی دینے لگے تھے۔ اماں تو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ نہانا چاہتے تو جلدی جلدی پانی گرم کرکے غسل خانے میں پہنچا دیتیں۔ سوتے ہوتے تو رات کو اٹھ کر ان کا بستر جھانکا جاتا۔ ان کا کمرہ جسے کبھی کبھار ہی صاف کر دیا کرتی تھی، اب ہر وقت چمکتا رہتا، بستر اور چادر بھی صاف، غرض ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں ان دنوں مجو بھائی کو ــــ میں تو خوش تھی، جب دور دور سے جھاڑنے پھونکنے والے مولوی آتے تو میرے دل میں سے ایسی دعا اٹھتی کہ مجو بھائی پر یہ سایہ برابر رہے تاکہ اچھے ہو جانے پر وہ گھر والوں کے برے سلوک سے تو بچے رہیں ــــ توبہ توبہ! میں بھی کیسی احمق تھی جو میرے دل میں ایسے ایسے خیالات آتے تھے!

مگر اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ خوش نہیں رہتے تھے۔ پہلے کچھ دنوں تک تو ٹھیک رہے۔ اب تو کچھ عجیب عجیب سی بجھی بجھی کیفیت ہر وقت ان کی آنکھوں میں رہتی، گویا وہ مجو بھائی کی آنکھیں نہ ہوں دو ویران [illegible] قبریں ہوں جن میں دھواں اٹھتا رہتا ہو ہر دم۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ اسی طرح کالے شاہ کا سایہ آیا ہوا تھا کہ اماں نے زور سے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور گھگھیانے لگیں۔ سائے نے بدستور زور سے پیروں کو ٹھکرا دیا۔ اماں بیچاری ہفتوں سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا رہی تھیں ــــــــ سامنے والی دیوار سے جا کر ٹکرائیں اور ان کا سر پھٹ گیا۔ تر تر لہو بہنے لگا سر سے۔ کچھ دیر تک اماں ہاتھ سے زخم دبائے رہیں، بدحواس سی اسی طرح کالے شاہ کے سائے سے مجو بھائی کو معاف کرنے کی التجا کرتی رہیں۔ پھر بیہوش ہو کر ایک طرف لڑھک پڑیں!

سارے گھر میں کہرام سا مچ گیا، ذرا دیر میں سایہ تو چلا گیا اور مجو بھائی اپنی حالت پر آ گئے مگر اماں جو بے ہوش ہوئیں تو پہروں چارپائی پر پڑی رہیں۔ ڈاکٹر نے کئی انجکشن دیئے دوائیں سنگھائیں۔ میں، بھابی اور مجو بھائی ہتھیلیوں اور تلوؤں میں تیل ملا کئے تب جا کر پورے

تین گھنٹے بعد ہوش میں آئیں ۔ ہوش میں آتے ہی پلٹ پلٹ کر چاروں طرف گھورا، پھر مجو بھائی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر یوں رونے لگیں کہ ان کے ساتھ میں کبھی اور بڑے بھیا بھی اپنے آنسو نہ روک سکے۔ صرف مجو بھائی کاٹھ سے چپ رہے، اور ان کا چہرہ جو پہلے اداس اداس مریضوں کی طرح تھا ایک دم سے زرد ہو گیا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور عجیب سی پشیمان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ دن بھر گھر واپس نہ آئے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتے رہے۔ اماں نے کئی بار سلطان کو بھیجا کہ انھیں بلاؤ۔ سلطان نے واپس آ کر بتایا کہ وہ کہتے ہیں، چلو آتا ہوں۔ آخر کار اسی حالت میں اماں بازار جا کر تھویان والے کے چبوترے سے انھیں کھینچ کر لائیں۔

اس دن اماں کا زخم دیکھ کر اور مجو بھائی کے حواس میں رہتے ہوئے بھی انھیں چھوڑ کر اس بے رخی سے چلے جانے پر مجھے مجو بھائی پر بڑا افسوس ہوا مجھے یقین ہوا کہ اب مجو بھائی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ کالے شاہ کے سائے نے ہم لوگوں کی محبت ان کے دل سے اکھاڑ پھینکی ہے۔ ورنہ اماں کو اتنا گہرا زخم آیا اور مجو بھائی انھیں یوں روتا بلکتا چھوڑ کر چل دیئے، کہاں اماں کا ذرا سر دکھتا تھا تو مجو بھائی آدھی آدھی رات تک ان کی چارپائی چھوڑ کر ہٹتے تک نہ تھے، کہاں آج یہ حالت تھی کہ ....

مگر میرا خیال غلط نکلا۔ کیونکہ اسی روز رات کے وقت جب گھر کے سب لوگ سو چکے تھے میں اماں کے پہلو میں چارپائی ڈال کر پڑی اونگھ رہی تھی کہ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی سایہ اماں کے پنیتانے کھڑا ہے۔ میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی کہ یقیناً یہ کالے شاہ کا سایہ ہے۔ اور اب اماں کی خیر نہیں لیکن غور کرنے پر مجو بھائی معلوم ہوئے۔ مجو بھائی اماں کے پیروں کو تھامے ہوئے سسکیاں لے کر رو رہے تھے اور بار بار معافی مانگ رہے تھے .... "اماں! مجھ گنہگار کو معاف کر دو! ..... اماں! آج میں نے بڑی تکلیف دی تھیں ......!!"

میں سمجھ نہ پائی کہ آخر مجو بھائی معافی کس بات کی مانگ رہے ہیں! اماں سے کیا خطا کی تھی انھوں نے کیسی تکلیف دی تھی اماں کو جو آج اس طرح گڑگڑا رہے تھے۔ اماں کو چوٹ ان کی وجہ سے

تو نہیں لگی تھی، وہ تو کالے شاہ کے سائے کی زیادتی تھی۔ تکلیف اماں کو اگر ہو رہی تھی تو کالے شاہ کے سائے کے باعث ۔۔ مجو بھائی نے تو کبھی دانستہ یا نادانستہ اماں کو یا کسی شخص کو تکلیف نہیں پہنچائی مجھے تعجب ہوا۔ جی میں آیا مجو بھائی کے آنسو خشک کر ڈالوں ۔ مگر ہمت نہ ہوئی ۔ پتہ نہیں مجو بھائی پہ اس وقت بھی کالے شاہ کا سایہ ہو ...... !

پھر مجو بھائی کی خوراک کم ہونا شروع ہو گئی۔ کہاں تو وہ اچھی غذائیں، جو اُن کو سایہ آنے کے بعد سے ملنے لگی تھیں، ان پر ٹوٹ کر گرتے تھے، کہاں اب بہ مشکل دو تین لقمہ اٹھاتے۔ پچھلے دنوں ان کی صورت نکھر رہی تھی۔ پھر اب ان کے گال پچکنے لگے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دوسرے تیسرے بخار بھی ہو جاتا۔ اندر ہی اندر جیسے : یماک لگ رہی ہو مجو بھائی کو ...... لوگوں کو بہت تعجب ہونے لگا کیونکہ اب کالے شاہ کا سایہ بھی ہفتے : دو ہفتے میں ایک بار ذرا دیر کے لئے آجاتا اور کسی نئی چیز کی فرمائش کئے بغیر چل دیتا۔ اماں خوش تھیں کہ کالے شاہ کا سایہ اب نہیں آتا، آتا ہے تو اُنکے بچے کو بہت کم تکلیف پہنچاتا ہے۔

پھر ایک دن ــــــ کہیں سے ایک مولوی صاحب آئے۔ انھوں نے اماں سے وعدہ کیا کہ میں کالے شاہ کے سائے سے مجو بھائی کو بچالوں گا مگر سوا بھر سونا، سوا بھر چاندی، سوا گز ریشم اور سوا سیر بادام کا غذی کی ضرورت پڑے گی۔

اس غریب گھرانے میں جو کچھ تھا اماں پہلے ہی کالے شاہ کے سائے کے نذر کر چکی تھی۔ اس وقت اماں کے پاس سو اَر روپئے بھی نہیں تھے۔ اماں نے ضد کر کے مکان سے ملحق "پرتی زمین" کو گروی رکھنے کی تجویز سوچی مگر مولوی صاحب تیسرے روز ہی اجمیر جانے والے تھے، اور گروی رکھنے اور روپیہ حاصل کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور لگ جاتا۔ اماں تڑپ کر رہ گئیں۔ اس دن اماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی اور روپیوں کے لئے وہ کس طرح گھگھیا رہی تھیں، کہاں کہاں نہ گئیں، کس کس کے آگے نہ گڑگڑائیں۔ آخر کار جب چاروں طرف سے مجبور ہو گئیں تو اپنے کمرے میں چھپ کر اس طرح چیخ چیخ کر روتی رہیں کہ ساتوں آسمان لرز گیا ہوگا اس ماتا بھرے گریہ سے !

مجو بھائی اس وقت اپنے کمرے میں تھے ان سے نہ رہا گیا تو اماں کے کمرے میں آکر ان کو تسلیاں

دینے لگے اور بڑے وثوق سے یقین دلایا کہ وہ ایک دم اچھے ہیں اور اب کوئی سایہ وایہ انھیں نہیں ستائے گا...... اماں کو بھلا کب یقین آنے والا تھا مگر مجبوری میں جھوٹی تسلیاں بھی انھیں بہلا گئیں یعنی بحالت مجبوری انھوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے بعد مجو بھائی واقعی کسی قدر اچھے بھلے رہے۔ چھ ماہ تک کوئی بات نہ ہوئی۔ اس درمیان میں انھوں نے پھر سے ملازمت کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اور اب کے رات دن کچھ نہ کچھ کرتے رہتے۔ گھر والوں کو یقین ہوگیا کہ اب کالے شاہ کے سائے نے مجو بھائی کو معاف کر دیا ہے۔ ان دنوں انٹرویو کے لئے وہ کتنی جگہ گئے، کتنی دوڑ دھوپ کی مگر بات نہ بنی۔ گویا مجو بھائی کی قسمت میں ملازمت لکھی ہی نہ تھی، کیوں کہ آخری بار جب انھوں نے ریلوے کے لئے درخواست دی تو انٹرویو تک میں پاس ہوگئے، گھر میں لوگ بہت خوش تھے۔ برسوں بعد مجو بھائی کے چہرے پر بھی کبھی کبھی چمک آجاتی۔ مگر ایک ساعت کے لئے وہ اسی طرح اداس ہوجاتے۔ بالآخر بلائے گئے، مڈیکل ٹسٹ ہوا اور ان فٹ کر دیئے گئے۔ ساتھ ہی یہ خوش خبری لیتے آئے کہ داہنے پھیپھڑے میں ایام مرحوم والے زخم کی ابتدا ہو چکی ہے۔

ہائے ہائے! کیسی کیسی مصیبت ٹوٹ رہی تھی ان دنوں ہمارے گھر پر۔ وہ جو ایک کچا دھاگا سا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا! اللہ اللہ کیا ہوگا۔ ڈاکٹر نے علاج کے لئے کہا، اچھی غذائیں تجویز کی تھیں۔ اور گھر یوں ویران تھا گویا کسی نے جھاڑو پھیر دی ہو چاروں سمت ــــ دوا دارو تو دور کی بات تھی، پہلے جو کالے شاہ کے سائے کے ڈر سے انھیں پیٹ بھر مناسب کھانا مل جاتا تھا وہ اب نہیں میسر تھا۔ ابھی یہ مصیبت ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک نئی افتاد آپڑی۔ ہم لوگوں پر یعنی میری شادی کی بات چل نکلی۔ افتاد ہی تو تھی ایسے وقت میں میری شادی! ایک طرف اماں کی کوکھ میں آگ لگ رہی تھی۔ ہم لوگ پیسہ پیسہ کو محتاج ہو رہے تھے، ایک طرف شادیانے بجانے کی بات چل رہی تھی۔ اتنی جلدی تو نہ تھی، یوں میری عمر بھی اتنی نہیں ہوگئی تھی کہ شادی کرنا عین ضروری ہو۔ بات یوں ہوئی کہ محلے کی ایک لڑکی جو عمر میں مجھ سے چھوٹی ہی ہوگی، سبحان خلیفہ کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب کیا تھا گویا محلے والوں کو گویا یقین ہوگیا کہ دوسری تمام محلے کی لڑکیاں عنقریب بھاگ نکلنے کی تیاریاں کر رہی تھیں، چنانچہ محلے میں دھڑا دھڑ لڑکیوں کی شادی شروع ہوگئی۔ میں جس گھر میں منسوب تھی وہاں سے بار بار

مامائیں اور لونڈیاں آنے لگیں۔ایک دن تو میری ہونے والی ساس اور سسر بھی آدھمکے اور صاف لفظوں میں کہدیا کہ اگر شادی جلد سے جلد نہ ہوسکی تو ہم اپنے لاڈلے کا کہیں اور نکاح کردیں گے۔اب کیا تھا۔ اماں کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔برسوں کی چھان بین کے بعد کہیں ایک لڑکا انھیں کم سے کم جہیز میں ہاتھ آیا تھا وہ بھی نکل بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔اماں کی مصیبتیں پہلے ہی کیا کم تھیں کہ اس اچانک ٹوٹنے والے آسمان کو بھی سنبھال سکتیں، ان کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی۔میری شادی کے لئے جو زیور تھے وہ پہلے ہی مجو بھائی پر اٹھا چکی تھیں، بڑے بھیا کے پاس پیسے کہاں ان کے تو اپنے نصف درجن کے قریب بال بچے روتے بسورتے نظر آتے۔انھوں نے تو چاروں لڑکوں کے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھالی اماں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، ان کی بیچینیوں کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔اس دن مجو بھائی سے نہ رہا گیا، جو مجو بھائی اپنے پہلو سے گزر جانے والی قیامت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، اس آفت پر تڑپ اٹھے۔اس دن جب بڑے بھیا دفتر چلے گئے، بچے اسکول اور بھابی باورچی خانے میں لیٹ گئیں تو وہ چپکے سے اٹھے اور لوہے کی ایک سیخ سے بھائی کے صندوق کے تالے توڑنے لگے، آہستہ آہستہ چوروں کی طرح۔اتنے میں بھابی کسی کام سے گئیں تو چلا اٹھیں۔میں اور اماں دوڑتی ہوئی پہنچیں۔دیکھا تو مجو بھائی ایک ہاتھ سے پوری قوت سے صندوق کا تالا پکڑے ہوئے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بھابی کو اور بھابی انھیں زور زور سے نوچ رہی ہیں اور گالیاں بک رہی ہیں اور مجو بھائی کہے جارہے ہیں کہ اس میں ضرور روپئے ہیں۔میں صندوق ضرور کھولوں گا۔اتنے میں اماں نے دوڑ کر مجو بھائی کو پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے الگ کر دیا۔وہ ہانپ رہے تھے، بُری طرح ہانپ رہے تھے اور کہہ رہے تھے "میں نے اپنی آنکھوں سے روپئے دیکھے ہیں اس صندوق میں۔اس صندوق میں روپئے ہیں...... ضرور ہیں......"

بھابی چلائیں "ہیں تو کیا تمھارے ہیں؟"

مجو بھائی نے ہانپتے ہوئے کہا "تو کیا تمھارے باپ کے ہیں؟"

بھابی نے برجستہ جواب دیا۔"نہیں تو کیا تمھارے باپ کے ہیں؟"

میں اور اماں دنگ رہ گئیں۔پہلی بار ہمارے خاندان میں کسی بہو نے اپنے شوہر یا دیور کو ایسی گالی دی تھی۔

مجو بھائی سے ضبط نہ ہوسکا اور انھوں نے تڑپ کر بھابی کی چوٹی پکڑلی اور زور سے ایک طمانچہ اُن کے گال پر رسید کر دیا۔ بال چھڑا کر بھابی نے بھیا کا پرانا جوتا اٹھا کر زور سے پھینکا جو سیدھے مجو بھائی کی کنپٹی پر لگا۔ میں اور اماں دھک سے رہ گئے۔ مجو بھائی یوں سن پڑ گئے جیسے پتھر کی مورتی ہوں۔ سوکھا ٹٹا نا چہرہ ایک دم سے ہلدی کی طرح زرد ہوکر سفید پڑ گیا۔ ادھر بھابی بدستور گالیاں بکے جارہی تھیں۔ کچھ دیر تک مجو بھائی خاموش رہے، پھر اچانک ان کا چہرہ قدرے سُرخ ہوگیا۔ اور انھوں نے لپک کر دیوار سے ٹنگے ہوئے گنڈاسے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور بڑھے بھابی کی طرف۔ یہ دیکھ کر اماں ان کے پیروں سے لپٹ گئیں۔ میں نے گنڈاسا تھام لیا۔ اور بھابی یہ رُخ دیکھ کر چپکے سے باہر نکل گئیں۔ اب مجو بھائی کو کوئی دیکھتا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے ہیں اور آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہا ہے۔ ادھر گنڈاسا اتنی مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے کہ میں چھڑاتے چھڑاتے تھک گئی مگر ان کی انگلیاں بدستور ۔۔۔ پر شکنجے کی طرح جکڑی رہیں۔۔۔ مگر اچانک کیا بات ہوئی کہ گنڈاسا ان کے ہاتھ سے آپ ہی آپ گر گیا اور وہ خود کٹے ہوئے تنے کی طرح کانپتے ہوئے زمین پر آرہے، اماں چیخنے لگیں ـــــ مجو بھائی بیہوش ہوگئے تھے۔

چار بجے بڑے بھیا دفتر سے آئے تو بھابی جو دن بھر سہمی سہمی تھیں لگیں چیخنے چلانے۔ وہ واویلا مچا، وہ شور و غل ہوا کہ سارا مکان سر پر اٹھا لیا گیا۔ ایسی ایسی جھوٹی سچی باتیں بھابی نے لگائیں کہ ہم لوگ دنگ رہ گئے۔ مجو بھائی ہوش میں تھے، اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ کمزوری باقی تھی، بھابی کی چیخ و پکار جھوٹ سچ سن کر آہستہ سے مسکرا دیئے۔ یوں گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد بھیا تمتماتے ہوئے آئے اور آتے ہی مجو بھائی کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگے ـــ انھوں نے پھوٹے منھ یہ تک نہ پوچھا کہ اس طرح آخر کیوں پڑے ہو، کیا بات ہے .... لگے کوسنے ـــــ طعنے دینے ـــــ حرام خور، نکما، مردود........ میرے ہی ٹکڑے پہ پلتے ہیں اور مجھی کو برباد کرنے پر پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ........ طرح طرح کی باتیں سنائیں انھوں نے۔ مجو بھائی کا بہانہ کرکے ہم ماں بیٹی کو سیکڑوں طرح کے طعنے دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ہی لوگوں کے

اکسانے پر مجو بھائی صندوق کا تالا توڑنے گئے تھے۔ بڑے بھیا بدستور جلی کٹی سنا رہے تھے ہم تینوں کو۔ مجو بھائی نے پلٹ کر اماں کی طرف دیکھا۔

"سنتی ہو اماں! بڑے بھیا کی باتیں؟ یہ مجھے ہی نہیں تم سب کو سنا رہے ہیں؟"

اماں نے کہا۔ "نہیں نہیں مجو مجھے کچھ نہیں کہہ رہے ہیں!" اور اماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، انھوں نے اپنے کانپتے ہوئے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے بھینچ لیا۔

جب بہت کچھ بول چکے بڑے بھیا تو جاتے جاتے بڑی سنجیدگی سے مجو بھائی کی طرف مخاطب ہوئے۔

"مجو! تم کل سے اپنے کھانے پینے کا انتظام کر لو —— میرے یہاں سے تمھیں چاول کا ایک دانہ بھی نہ ملے گا۔"

بڑے بھیا نے کچھ ایسے لہجے میں یہ بات کہی کہ مجو بھائی چونک پڑے۔ ان کے چہرے کی ایسی کیفیت ہوگئی کہ گویا دوبارہ بھائی نے ایک جوتا جڑ دیا ہو ان پر۔

بڑے بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں، اماں اور مجو بھائی سکتے کے عالم میں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ کچھ دیر بعد سکتہ ٹوٹا اور اماں منھ پر آنچل رکھ کر پہلی بار اس شدت کے ساتھ روئیں جیسے ان کے کسی بڑے عزیز کا جنازہ اٹھ گیا ہو۔

رات ہوئی، صبح ہوئی...... مگر مجو بھائی کو کھانے کے لئے ایک دانہ نہ ملا گھر سے۔ رات کو اماں چار آنے کی پوریاں لے آئیں بازار سے جنھیں مجو بھائی نے چھوا تک نہیں، رات کو بھابی مجھے اور اماں کو بڑے روکھے لہجے میں بلانے کو آئیں۔ ہم نے جانے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن ہم ماں بیٹی نے تو کھانا کھا لیا مگر مجو بھائی نے گھر کا پانی تک نہ پیا۔ پیاس لگی تو باہر نکل کر پانی پی آئے۔ اور چپ چاپ چارپائی پر اسی طرح لیٹ گئے —— دوپہر کو کمرے سے نکل گئے۔ شام ہوئی، رات آئی۔ مگر مجو بھائی لوٹ کر نہیں آئے۔ اماں بےچین ہو اٹھیں، جانے کیسے اماں کو پتہ مل گیا کہ آج کی رات ان پر بڑی بھاری گزرے گی۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتیں، ہُو کا عالم، رات آدھی سے زیادہ گزر گئی، سارا عالم سو رہا تھا، میں بھی اونگھ رہی تھی مگر اماں

گویا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں جیسے رہ رہ کر سوئی چبھو دیتا ہو ان کے دل میں کوئی آخر نہیں رہا گیا تو بڑی خوشامدوں سے بڑے بھیا کو جگایا اور ساتھ لئے۔ لالٹین سے ڈھونڈنے نکلیں، کالے شاہ کے مزار کے قریب سے گزرنے لگیں تو اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی، لالٹین لئے اماں اور بھیا دوڑے۔

مجو بھائی فرش پر اوندھے منھ پڑے کراہ رہے تھے۔ بھیا نے لپک کر اٹھایا تو ڈھیروں خون سے منھ اور قمیص کا گریبان لتھڑا ہوا تھا۔

رات گئی، صبح ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب آئے۔ دیکھنے کے بعد بھیا کو الگ لے جا کر نفی میں گردن ہلائی، اماں مجو بھائی کو گود میں لئے پاگلوں کی طرح کبھی ان کا منھ چومتیں۔ کبھی پیشانی چھوتیں۔ میں، بھابی اور بھیا سبھی منھ میں کپڑا دئے چیخیں دبا کر رو رہے تھے، آخر کالے شاہ کے سائے نے مجو بھائی کی جان لے ہی لی۔

عین اسی وقت مجو بھائی نے آنکھیں کھولیں۔ پھر ایک بار گردن گھما کر چاروں اور دیکھا پھر اماں پر ٹکٹکی لگا دی، ان کا سر اماں کی گود میں تھا۔ اماں پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"مجو، کیسے ہو...... مجو...... میرے لال...... کچھ چاہئے میرے بچے......؟"

جواب میں مجو بھائی مسکرا دئے، عجیب سی مسکراہٹ، جیسے ساری دنیا پر ہنس رہے ہوں۔

"ذرا سا بھات کھلاؤ گی اماں اپنے ہاتھ سے...... بہت دن ہوئے تمھارے ہاتھ سے کھائے ہوئے......!"

پھر بڑے بھیا کی طرف مخاطب ہوئے "بھیا! ذرا سا بھات دو گے آج اپنے گھر کا مجھے؟ آپ نے منع کر دیا تھا نا بھابی کو کہ مجو کو ایک دانہ نہ دینا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ کبھی نہ کھاؤں گا۔ مگر میں ہار گیا بڑے بھیا، بری طرح ہار گیا...... آج ذرا سا کھانا دیدو بھیا...... ورنہ میری روح تڑپتی رہے گی قیامت تک......!!"

یہ سنتے ہی ہم لوگوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ اماں دوڑیں، باورچی خانے سے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا بھات اور دال لے آئیں، ادھر آنکھوں سے جھر جھر آنسو گر رہے تھے۔

ادھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں بدحواس سی .... !

اسی طرح گود میں سر رکھ کر اماں نے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے چھوٹا سا لقمہ مجو بھائی کے منہ میں رکھ دیا ــــ "ارے میرے لال! کھالے بیٹا !! آخر کالے شاہ کے سائے نے تو تجھے نابود ہی کر دیا میرے بچے .... !"

مجو بھائی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "ہاں اماں! یہ کالے شاہ کا سایہ بڑا منحوس ہوتا ہے۔ مگر اماں! اب کبھی نہ آئے گا یہ سایہ تمھارے گھر ....!!"

پھر خاموش ہوگئے، دو لقمہ کھانے کے بعد ذرا سا پانی پیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں اُبکائی آئی اور سارا بھات منہ سے باہر آگیا۔ اماں چیخ کر آنچل سے منہ پونچھنے لگیں۔ اتنے میں مجو بھائی نے ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر بول نہ سکے۔ ہاتھ گر گیا۔ ایک ہچکی آئی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

نورالحسن ہاشمی

ڈاکٹر سعدی

وہ مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے میرے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک میرا پاؤں رپٹا اور میں یکبارگی پانچ چھ سیڑھیاں طے کر گیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچے پھسلنے والے تختے پر سے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ سیڑھیاں سیمنٹ کی تھیں اور ڈاکٹر سعدی کے سوا جس نے بھی مجھے گرتے دیکھا دم بخود ہو گیا۔ اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔

ڈاکٹر سعدی کو میرے گرنے پر ہنسی کا جو دورہ پڑا وہ میرے لئے بے حد حیران کن تھا۔ اُسے میں نے پہلی مرتبہ قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ہنسی کا ایک طوفان تھا جو تھمتا ہی نہ تھا۔ یکایک اُس نے کہا۔ "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے" اور پھر وہ ہنسی کے پالنے میں جھولنے لگی اور میں غم و غصہ کے عالم میں مٹھیاں بھینچ رہا تھا "یہ کون سا موقع ہے ہنسنے کا؟" دوسرے لوگوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا مگر ڈاکٹر ہے کہ ہنسے چلے جا رہی ہے یہ ماجرا کیا ہے؟ میرے لئے یہ نفسیاتی تحقیق کا ایک مسئلہ بن گیا۔ وہ اس لئے کہ میں نے ڈاکٹر کو قہقہے تو درکنار کھل کر مسکراتے ہوئے بھی بہت کم دیکھا تھا۔ میں اُسے اس معاملہ میں بہودن کہا کرتا تھا۔ وہ ہنسنے اور مسکرانے میں بے حد بخل سے کام لیتی تھی۔ وہ حد درجہ متین، حد درجہ سنجیدہ اور کم سخن تھی۔ اور پھر اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی ۲۲-۲۳ برس۔ ہر بات پر نا اور نہیں کہنا اس کی عادتِ ثانیہ تھی۔

"ڈاکٹر میرے ساتھ چائے پیوگی؟" ـــــ "نہیں"۔

"ڈاکٹر کل پھر ملنے آؤں؟" ـــــ "نہیں"۔

"ڈاکٹر آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو" ـــــ "نہیں"۔

"ڈاکٹر میں تمھارے منفی انداز سے سخت تنگ ہوں۔ اب تم سے کبھی نہ ملوں گا"۔

"نہ ملئے"۔

"ڈاکٹر تم کبھی مسکراؤگی بھی؟" ـــــ "نہیں"۔

غرضیکہ "نا" اور "نہیں" اُسکی شخصیت کا حصّہ بن چکے تھے۔

میں نے بہت سوچا کہ آخر ڈاکٹر میرے گرنے پر اتنی لطف اندوز کیوں ہوئی؟ سوچ سوچ کر اسی نتیجے پر پہنچا کہ شاید اُس کی زندگی میں طرب انگیز یا قہقہہ افزا لمحات بہت کم آئے ہیں۔ شاید وہ ہوش سنبھالتے ہی ایک ایسی چٹیل اور ہموار راہ پر چلنے لگی جس پر نہ کہیں اونچ نیچ تھی نہ آس پاس چرند یا پرند یا سبزہ یا درخت یا پھول یا ہنستے کھیلتے چہرے یا شریر لڑکے لڑکیاں، غرضیکہ اس کے ۲۲-۲۳ برس نہایت ہی متین و سنجیدہ بلکہ شدید نظم وضبط کے ماحول میں گذرے ہوں گے حتٰی کہ اُس کے اسکول اور کالج کے زمانے میں یا اس کے محلّے یا گلی میں کوئی لڑکا یا لڑکی پھسل کر گری بھی نہ ہوگی جسے دیکھ کر ڈاکٹر ہنستی۔

اتنا مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا گھریلو ماحول سخت مذہبی تھا۔ والدین صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند۔ والدین کے علاوہ اُس کی بڑی ہمشیرہ بھی حج کے فریضے سے فارغ ہوچکی تھیں۔ وہ خود بھی پانچ وقت نماز پڑھتی تھی۔ خدانے اُسے کتابی چہرے سے نوازا تھا۔ سانولی سلونی، تیکھے دلکش ناک نقشے والی، ڈاکٹر سعدی لباس نہایت سادہ پہنتی تھی۔ اُسے میں نے کبھی ریشمی لباس میں نہیں دکھیا۔ وہ ہمیشہ سفید سوتی شلوار اور ہلکے پرنٹ کی سُوتی قمیص میں ملبوس رہتی۔ میک اپ کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ بال اُس کے

اکثر خشک ہی دیکھے۔ سیدھی سادی کنگھی اور جوڑا کرلینا۔ معمولی سینڈل پہنتی لیکن ساتھ جراب ضرور ہوتے۔

سیڑھیوں سے رپٹنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نے فون پر مجھ سے پوچھا "اُس دن آپ کو چوٹ تو نہیں لگی تھی؟" یہ پوچھتے ہی اُس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں نے غصّے میں فون بند کردیا۔ اُس نے پھر فون کیا اور پھر یہی پوچھا۔ میں نے غصّے میں جواب دیا۔ "نہیں"

مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہنسی پر ضبط کر رہی ہے۔ اُس نے کہا "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے، آپ چھپا رہے ہیں"۔ میں نے پھر کہا "نہیں" اُس پر اُس نے جھلّا کر پوچھا "یہ نہیں نہیں کیا لگا رکھی ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "یہ تم ہی سے سیکھا ہے۔ تم بھی تو ہر بات پر نہیں اور نا ہی کہتی ہو"۔ اب کے اُس نے فون بند کردیا۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ میرے دفتر آگئی اور کہنے لگی "میرے ساتھ میرے گھر چائے پیئیں۔ ابا بھی ہوں گے"۔ میں نے فوراً کہا "نہیں"۔ اُس کا متین اور سنجیدہ چہرہ سُرخ ہوگیا۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "اچھا تو نہیں آئیں گے آپ"۔

میں نے شرارت کے انداز میں پھر کہا "نہیں"۔

وہ فوراً اُٹھی اور جانے لگی، میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑا۔ اُس نے فوراً میرا بازو جھٹک دیا اور کہا — "مجھے ہاتھ نہ لگایئے آپ بہت بڑھتے جارہے ہیں" — مجھے گویا پسینہ سا آگیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس طرح اُسے ہاتھ لگایا تھا۔

میں نے ملتجیانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ غضب ناک چہرہ لئے ہوئے بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا۔ "چائے پینے کس وقت آؤں؟"

چہرے پر کوئی تغیر لائے بغیر اُس نے کہا۔ "کل صبح ساڑھے دس بجے"۔ اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

ایک منٹ بعد وہ اُٹھی اور میرے منہ پر "السلام علیکم" مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن میں ٹھیک صبح کے ۱۰ بجے سعدی کے گھر پہنچا۔ اُس کے ابا بھی موجود تھے۔ چائے نہایت پُرتکلف تھی۔ پھل، مٹھائیاں، کیک، پیسٹری سبھی کچھ موجود تھا۔ مگر چائے دانیاں دو تھیں۔ ایک بڑی، ایک ننھی سی۔ بڑی میں چائے اور چھوٹی میں دودھ تھا مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا۔ یہ لوگ اچھے خاصے خوشحال ہیں۔ مکان، زمین، بینک بیلنس سبھی کچھ ہے۔ پھر کراکری کے معاملے میں کنجوسی کیوں؟ معمولی دودھ دان دو ڈھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ چائے دانی سے دودھ برتانا اور وہ بھی ایک پُرتکلف چائے پر مجھے عجیب سا لگا۔

اس سے پیشتر بھی مجھے دو ایک بار سعدی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُس نے دونوں مرتبہ دودھ اور چینی سے بھرپور چائے کی پیالی مجھے پیش کی۔ اُس وقت تو میں زہر مار کر گیا۔ مگر بعد میں میں نے اُس سے احتجاج کیا۔ شاید یہ احتجاج اُسے یاد تھا۔ اسی لئے اگلی مرتبہ اُس نے چائے دودھ اور شکر الگ الگ پیش کی مگر دودھ چائے دانی سے برتایا۔ دو چار دن بعد میں نے اس سے پھر احتجاج کیا۔ اس نے بہتیری تاویلیں پیش کیں مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ وہ جھلّا اٹھی اور کہا "آئندہ آپ میرے گھر نہیں آئیں گے۔"

اس پُرتکلف چائے پر ادھر اُدھر کی بیکار سی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے ابا کی موجودگی میں یہی کچھ ہونا تھا۔ چائے کے بعد میں چلنے لگا تو ڈاکٹر نے کہا — "مجھے کالج ڈراپ کر دیں۔" اس فقرے میں بھی حکم کا عنصر موجود تھا۔ اس کے ابا ہمیں سڑک تک چھوڑنے آئے۔ وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خاموش رہی۔ اور سامنے ٹریفک کا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر تم بھلی چنگی لڑکی ہو۔ ہر لحاظ سے نارمل ہو۔ مگر تمھارے مزاج میں تکبّر، درشتی، بے نیازی، پارسائی یا تو قدرتی طور پر موجود ہے یا تم ضرورت سے زیادہ بنتی ہو۔"

بس وہ تلملا گئی — چمک کر بولی: "تکبّر سے مجھے سخت نفرت ہے۔ درشتی میرے مزاج کا حصّہ ہرگز نہیں۔ بے نیازی سے نہ جانے آپ کا کیا مطلب ہے؟ نماز مجھے ورثہ میں ملی ہے — یاد رکھیے میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

اتنا طویل فقرہ اس نے فرفر بولا۔ بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے۔ میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ باقی مختصر راستہ خاموشی میں کٹا — ہسپتال کے قریب پہنچے تو اُس نے نہایت روکھے پن سے کہا "بس مجھے گیٹ ہی پر اتار دیجئے۔" میں نے فوراً بریک لگائی وہ بگولے کی طرح اُٹھی اور باہر نکل کر اُس نے کار کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ تمام گاڑی ہل گئی۔ چہرہ کالج ہی کی طرف رکھتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر السلام علیکم میرے منہ پر دے مارا اور سامنے والی سیڑھیوں میں غائب ہوگئی۔

"کس لڑکی سے پالا پڑا ہے۔" میں بڑبڑایا اور کار لوٹا کر گھر کا رُخ کیا۔

میرے لئے ڈاکٹر ایک معمہ تھی — مجھے اُس کی بے نیازی سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اُسکی پارسائی سے۔ وہ بے حد مقدس دکھائی دیتی تھی۔ اُس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے میں کسی نن سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ طویل فقرے بہت کم بولتی تھی۔ اُس کی مختصر گوئی میں بھی نا اور نہیں کی بھرمار ہوتی تھی۔ میں اُس کے پاس دو دو گھنٹے بھی بیٹھا مگر باتیں مجھی کو کرنا پڑیں۔ ان تمام حوصلہ شکن باتوں کے باوجود ڈاکٹر سے مجھے بے پناہ محبت ہو چکی تھی۔ میری زندگی نہایت پرسکون ڈگر پر چل رہی تھی۔ فرائض کی ادائیگی میں میرا بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں خواتین اور نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ خواتین اور لڑکیوں میں بعض اوقات نہایت دلکش اور شوخ و شنگ ہستیوں کا بھی سامنا ہوتا تھا، لیکن حاشا وکلا میں کبھی پھسلا نہیں۔ ایک آدھ مرتبہ لغزش ہوئی مگر فوراً سنبھل گیا۔ مگر ڈاکٹر کا معاملہ ہی کچھ اور تھا — وہ چپکے سے بلکہ پنجوں کے بل میری زندگی میں داخل ہوئی اور پھر بلا تکلف میرے سکونِ قلب پر چھاپہ مار کر بیٹھ رہی اور مجھے سنبھلنے کا موقع

ہی نہ دیا۔ بڑی دیدہ دلیر نکلی۔

وہ دن مجھے خوب یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی تھی اور بڑے موثر انداز میں اپنی ایک سہیلی کے کیس کی وضاحت کی تھی۔ اُس کے سر اور بازوؤں کی جنبش نے اُس کی زبان کا ساتھ دیا اور وہ بزعم خود میدان مار کر چلی گئی۔ چند دن بعد وہ پھر نمودار ہوگئی اور پوچھا — "آپ نے اُس کیس کا کیا کیا؟"

یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا اور اُسے حل کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ میں نے کہا "ابھی کچھ دن لگیں گے" — چندے توقف کے بعد وہ چلی گئی اور ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آن دھمکی۔

اسی دوران میں میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ماتحت عملہ نے کیس خاصا خراب کر رکھا تھا اور درحقیقت ڈاکٹر کی سہیلی سے بے انصافی ہوئی تھی۔ میں نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیا اور اُسے اب محض اطلاع ہی دینا تھی کہ فیصلہ اُس کی سہیلی کے حق میں ہو چکا ہے — دوسری طرف یہ خدشہ تھا کہ اگر فیصلہ سنا دیا تو ڈاکٹر کے ساتھ آج کی نشست آخری ہوگی۔ میں چاہتا کہ اُس کا آنا جانا بند نہ ہو۔ ڈاکٹر نے بیٹھتے ہی پوچھا "کچھ فیصلہ ہوا؟"

میں نے عرض کی "انشاء اللہ جلد ہی کام بن جائے گا اور میں آپکو اطلاع بھجوا دونگا۔"

"نہیں۔ آپ آج ہی مجھے دوٹوک جواب دیجئے۔"

"دوٹوک جواب میرے لئے ناممکن ہے کیس کو ابھی کئی مراحل طے کرنا ہیں مگر انشاء اللہ کام بن جائے گا۔"

"کیس کس اسٹیج میں ہے اور ابھی کتنے دن لگیں گے؟"

"آپ تفصیلات نہ پوچھیں۔"

"میں ضرور پوچھوں گی۔"

"میں جواب نہیں دوں گا۔"

"نہ دیں۔ میں ہفتہ بعد پھر آؤں گی۔"

"ضرور تشریف لائیں۔"

وہ جانے لگی تو میں نے ایک منٹ بیٹھنے کو کہا ـــــ وہ بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "ایک سوال کروں آپ ناراض تو نہیں ہونگی؟"

"ناراض ہونیوالی بات ہوئی تو ضرور ہونگی۔"

"یہ بتلایئے کہ آپکی سہیلی خود اپنے کیس کیلئے کیوں نہیں آئی؟"

"وہ پردہ کرتی ہے۔"

"آپ کیوں نہیں کرتیں۔"

"آپ کون ہوتے ہیں یہ بات پوچھنے والے؟"

"بتلایئے نا!"

"میرے والدین نے اجازت دے رکھی ہے۔"

"کیوں؟ آپ حاجی باپ کی بیٹی ہیں۔"

"میرا جو پیشہ ہے اس میں پردہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔"

"ویسے آپ پردے کی حامی ہیں؟"

"جی۔"

"تو گویا دولت کمانے کی خاطر آپ نے پردہ چھوڑنا مناسب سمجھا۔"

"نہیں، خدمتِ خلق کے لیے۔"

"خدمتِ خلق تو بہانہ ہے۔ آپ کے بعض ہم پیشہ لوگ تو لوگوں کی کھال کھینچ لیتے ہیں۔"

"بات پردہ کی ہو رہی تھی، آپ پیشے پر آگئے۔ میں نے اپنے والدین کی اجازت سے پردہ چھوڑا ہے۔ اُن کی مرضی کے خلاف نہ میں نے آج تک کوئی اقدام کیا ہے نہ آئندہ کبھی کروں گی۔"

"آپ بڑی نیک بخت اور سعادت مند ہیں۔"

"نہیں۔ اچھا میرا وقت ضائع نہ کریں۔"

اُس نے میرے منہ پر سلام علیکم کا گولہ دے مارا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

الٹی میٹم کے مطابق وہ ہفتہ عشرہ بعد پھر آئی اور جواب طلب کیا۔ میں نے اسکی نسبت کو طول دینے کے لئے اُسے ایک تار دکھلایا، جو اُس کی آمد سے چند منٹ پہلے مجھے ملا تھا۔ میں نے اُس سے مشورہ طلب کیا۔ تار پڑھ کر اُس نے پوچھا "یہ کون لڑکی ہے؟"

"میری عزیزہ ہے۔"

"کیوں۔ بیمار رہی ہے؟"

اُس کی شادی کا مسئلہ نوک پر پہنچا ہوا ہے۔ جہاں وہ شادی کرنا چاہتی ہے والدین اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں جا کر اُسکے والدین کو ہموار کر دوں۔"

"آپ کے نزدیک لڑکی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی۔"

"میں صورت نہیں پوچھ رہی ہوں۔ ویسے کیسی ہے؟"

"میں بھی صورت کا ذکر نہیں کر رہا۔ سیرت اسکی بہت اعلیٰ ہے۔"

"غلط۔ سب غلط۔ جو لڑکی والدین کی مرضی کے خلاف رشتہ کرے۔ وہ ہرگز اچھی سیرت کی مالک نہیں ہو سکتی۔ آپ ہرگز نہ جائیں ورنہ آپ بھی برابر کے مجرم ہونگے۔"

نہ جانے کیوں! میں نے اُس کی موجودگی میں تار بھیجدیا کہ "میں نہیں آسکتا۔" تار بھجوانے کے بعد میں اصل موضوع پر آیا اور بتایا کہ اس کی سہیلی کا کیس سلجھا دیا گیا ہے اور اب وہ اگلا قدم اُٹھا سکتی ہے۔ اُس نے نہایت متانت سے شکریئے کا فقط ایک لفظ ادا کیا اور اپنی سہیلی کا کیس بھلا کر پوچھا "آپنے تار بھجوانے میں بہت عجلت سے کام لیا۔"

"آپکا یہی مشورہ تھا نا؟"

اُس نے "آپ نے اچھا کیا" کہا اور اپنی کتاب اور سٹیتھو سکوپ سمیٹ، سلام علیکم کہہ

یہ جا وہ جا۔ اور میں دیکھتا ہی رہگیا۔

نہ جانے اب وہ آئے گی یا نہیں۔ جس کام کے لئے وہ آتی تھی وہ تو ہو گیا۔ اب وہ کیوں آئے گی ـــــ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ چند منٹ سکتہ کے عالم میں رہ کر میں دوبارہ اپنے کام میں غرق ہو گیا۔

دن اور ہفتے گذرتے رہے مگر نہ اُس کا فون آیا نہ وہ خود آئی۔ میں نے بھی دل کو تسلی دی کہ ایک دور تھا جو ختم ہوا۔ دنیا کا کاروبار خواہ کیسا ہی ہو اسی نہج پر چلتا ہے مگر ڈاکٹر کی یاد لاشعور میں گھر کر چکی تھی۔

محبت کے تیر مجھ پر کم ہی کارگر ہوئے تھے۔ میں خود کو اس معاملے میں سراپا ڈھال سمجھتا تھا مگر ڈاکٹر اور ہی چیز تھی۔ اُس کے اکھڑپن میں بھی ایک ایسی جاذبیت تھی کہ میری ڈھال خود بخود اُسکے قدموں میں جا گرتی تھی۔

مہینوں پیشتر وہ دوسری مرتبہ جب مجھ سے ملنے آئی تھی تو ملاقات مختصر تھی مگر فتنہ انگیز۔ ہوا یوں کہ اس کی سہیلی کا کیس سنتے ہوئے نہ جانے میرے منہ سے کیا فقرہ نکلا کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بے اختیار مسکرا دی۔

بس یہی مسکراہٹ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کے لبوں پر تبسم یہی کوئی پانچ سیکنڈ رہا ہوگا مگر اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں زندگی بھر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں سے ملا ہوں گا۔ ان میں لڑکیوں اور خواتین کا تناسب بھی خاصا تھا مگر ایسی توبہ شکن مسکراہٹ !!! معاذ اللہ!

میں اُس کے خلوص اور دلکشی کا روز اوّل ہی سے قائل تھا۔ اپنی سہیلی کی وکالت اُس نے جس خلوص سے کی تھی۔ وہ بجائے خود میرے لئے ایک عظیم الشان تجربہ تھا لیکن اُس کی مسکراہٹ نے تو میری زندگی کا دھارا ہی موڑ دیا۔ اُس مختصر تبسم میں وہ میرے سامنے کائنات کی حسین ترین شے بن کر جلوہ گر ہوئی اور میں بقائمی ہوش حواس

اُسکے قدموں میں تھا۔

جب پانچ چھ ملاقاتیں ہوگئیں تو ایک دن جی کڑا کر کے میں نے کہا۔ "ڈاکٹر ذرا مسکرادو۔"
اُسکی بھویں تن گئیں۔ پوچھا "کیا مطلب ؟"
"مطلب یہی کہ تم کبھی مسکراؤ گی بھی یا نہیں ؟"
"نہیں، ہرگز نہیں۔"
"سنو سعدی۔ تمھاری مسکراہٹ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں نے ایسی مسکراہٹ زندگی بھر نہیں دیکھی۔ چلو بناوٹی تبسم ہی لبوں پر لے آؤ۔"

ڈاکٹر کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا "دیکھیے جناب میرے سامنے ایڑی بیڑی باتیں نہ کیجیے۔ میں اس قسم کی خرافات کی عادی نہیں ہوں۔ میں آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

خرافات کا لفظ میرے منہ پر طمانچہ تھا۔ میں نے فوراً معافی مانگ لی اور وہ خاموش رہی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب بھی اُس سے ملاقات ہوئی تو صرف دوا اور دو چار قسم کی باتیں کروں گا۔ یعنی اتنی ہی جتنی کہ اشد ضروری ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ پھر آئی تو اُس کے مختصر سوالوں کا جواب میں نے مختصر تر الفاظ میں دیا اور اُس کی طرف دیکھے بغیر۔ گفتگو میں بار بار وقفہ آیا۔ نہایت تکلیف دہ سکتہ مگر میں اپنی روش پر جما رہا۔

آخر اُس نے کہا "اچھا میں چلتی ہوں۔"

میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے "دو منٹ بیٹھیے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ چائے کی پیالی پی لیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ چائے آئی۔ اردلی چائے بنانے لگا تو اُس نے کہا "تم جاؤ میں خود بناؤں گی۔"

اُس نے میرے آگے چائے کی پیالی رکھ دی اور حسبِ معمول خاموش بیٹھ رہی۔ میں نے طنزاً کہا "آپ نے بہت زحمت کی۔ شکریہ!"

"نہیں۔"

"شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔"

یہ سوچکر کہ شاید چائے کی پیالی پینا گوارا کر کے اُس نے اپنے بہتر موڈ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر کی ہانکنا شروع کی "سعدی تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اعلےٰ تعلیم کیلئے باہر جاؤں گی۔"

"کب؟"

"اگلے سال۔"

"پھر؟"

"پھر یہیں آکر پریکٹس کرونگی۔"

"خوب دولت کماؤگی!"

"خدمتِ خلق کروں گی —"

"پریکٹس شہر کے کس حصّہ میں کرو گی؟"

"یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"پریکٹس وہیں کرنا جہاں تمھارے والد نے تمھارے لئے چار کنال زمین لے رکھی ہے۔ تمھارے آنے تک وہاں ایک بہت اعلیٰ کالونی آباد ہو چکی ہوگی۔"

میرے اس فقرے پر ڈاکٹر تیوراسی گئی۔ "کہاں ہے وہ چار کنال زمین؟ آپ کو کیسے علم ہوا اس بات کا؟"

"چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتلاؤ کہ اپنی زمین میں سے مجھے ایک کنال زمین دو گی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر پہلی بار میں نے آثار چڑھاؤ دیکھا۔ وہ کسمسا سی گئی اس کے لب ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک دم جانے کا فیصلہ کیا اور چند لمحوں میں وہ میرے کمرے سے باہر تھی۔

اُس کی سہیلی کا معاملہ سلجھ جانے کے دو تین ماہ تک اُس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی اور نہ اُس کا فون آیا۔ میں اُس سے قریب قریب مایوس ہو چکا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک صبح ہسپتال جا نکلا۔ وہ راؤنڈ پر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ نرس کو کہا "تم چلو میں آتی ہوں۔" نرس آگے نکل گئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی۔"

"کیوں وقت ضائع کیا آپ نے؟"

"بس آپ سے دو منٹ بات کرنا تھی۔"

"مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"کیا اور کسی وقت آسکتا ہوں؟"

"کل۔"

"کس وقت؟"

"ساڑھے پانچ بجے شام

"کہاں؟"

"میرے کمرے میں

"آپ کا کمرہ کہاں

ڈاکٹر نے سمجھا دیا۔

"مجھے دستک دینا ہوگی؟"

"دروازہ کھلا ہوگا۔ ہلکی سی دستک دے کر اندر آجائیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنے کمرے کی نشان دہی کی تھی ـــــ اُس سے خلوت میں ملنے کی امید نے میرا سکونِ قلب لوٹ لیا۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے سہ پہر تک میں بہت ہیجان میں رہا۔

دوسری سہ پہر میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے آرام کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ شاید تھکن کے مارے اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں چند منٹ اُسے دیکھا کیا۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ رخسار پر کنڈلی مارے ہوئے تھی مجھ سے نہ رہا گیا اور میں دفورِ جذبات سے مجبور ہو کر جھکا اور اُس کے دائیں رخسار کو ہلکے سے چوم لیا۔

ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ وہ زقند بھر کر اُٹھی، اُسکی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دروازہ اندر سے بھیڑا اور مجھ پر برس پڑی۔

اُس نے دوسری مرتبہ مجھ سے اتنی طویل بات کی جو نہایت ہی تلخ تھی۔

"آپ کو جرأت کیسے ہوئی؟ آپ نہایت ذلیل ہیں۔ میری غفلت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی؟ آپ نے کمینگی کی ہے، آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسی ہی حرکت ہو تو آپ کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ میرے والدین نے مجھ پر اعتماد کر کے یہاں بھیجا ہے۔ اگر میں اُن کا اعتماد کھو بیٹھوں تو مجھ پر ہزار لعنت۔ کاش آپ کی اس حرکت سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی!! میں آپ کی صورت سے بیزار ہوں۔ نکل جائیے میرے کمرے سے اور خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا ـــــ"

ایک ہی سانس میں وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئی اور اگر میں اُس کے کمرے سے نکل نہ جاتا تو نہ جانے وہ اور کیا کچھ کہتی۔

ایک اُبھرتی ہوئی حسین عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک دلکش غزل بڑے المناک اور تلخ مقطع پر ختم ہو لی۔

اس ایلیسے کو دو ماہ ہی گذرے ہوں گے کہ مجھے اچانک تبادلے کا حکم ملا۔ انہی دنوں میرا ایک دوست گردے کے درد میں مبتلا ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ میں لپک جھپک اس کی عیادت کو جاتا اور اُسی طرح ہسپتال سے باہر نکل آتا کہ کہیں ڈاکٹر دیکھ نہ پائے اور سب کے سامنے مجھ پر برس نہ پڑے۔

ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بڑا ڈاکٹر اسے لئے میرے بیمار دوست کے کمرے میں داخل ہوا۔ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آگیا۔

ڈاکٹر سعدی نے مجھے دیکھا اور فوراً اپنے سینئیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینئیر ڈاکٹر نے میرے دوست کا معائنہ کیا، چارٹ دیکھا اور سعدی کو کچھ ہدایات دیں۔ میں اس دوران ٹہل کر کمرے کے ایک کونے کی طرف سرک گیا تھا۔

بڑے ڈاکٹر نے میرے دوست کو تسلّی دی اور چلے گئے۔ سعدی اُن کے پیچھے تھی۔ اضطراب کی سی کیفیت میں میں بھی کمرے سے باہر نکلا اور سعدی کے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ ڈر کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آگیا اور میں ٹھہرنے کی بجائے اُس سے آگے نکل گیا۔

اُس نے مجھے آواز دی ___ میں گویا کانپ گیا۔

میرے نزدیک آکر وہ بولی "یہ آپ کے کون ہیں؟"

"میرے دوست ہیں"

"حالت کافی خراب تھی۔ اب اللہ کے فضل سے بہت بہتر ہے"

میری جان میں جان آئی، ہمت کر کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب میرا تبادلہ ہو گیا ہے"

"جھوٹ"

میں نے اپنے تبادلے کا حکم نکال کر دکھایا اور اس نے اسے پڑھنا بھی گوارا کر لیا۔ کاغذ لوٹاتے ہوئے اُس نے کہا — "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نہیں جائیں گے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔

"میں تو شاید پرسوں روانہ بھی ہو جاؤں۔"

"اچھا۔"

"جی ہاں — اور آپ ناراض بھی تو ہیں۔"

"فضول باتیں نہ کیجیے۔" پھر ایک لمحہ رک کر بولی "تو گویا آپ جا رہے ہیں؟"

"گویا نہیں۔ یقینی طور پر۔"

"تو پھر خدا حافظ۔"

اور وہ السلام علیکم کہہ کے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں اسکے پیچھے دوڑا اور اُسے ٹھہرالیا۔ "کیا میں آپ کو خط لکھ سکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا؟"

اور مجھ سے سوائے "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" کے کچھ بھی تو نہ کہا گیا اور وہ پھر السلام علیکم کا طمانچہ مار کر آگے چل دی۔

"یا خدا! یہ کیسی لڑکی ہے؟" یہ سوچتا ہوا میں منہ لٹکائے اپنے دوست کے کمرے میں آ بیٹھا۔ مگر جی نہ لگا اور گھر چل دیا۔

تقریباً چار برس بعد ڈاکٹر سعدی کے شہر میں پھر میرا تبادلہ ہوگیا۔ ٹرانسفر سے چھ ماہ پیشتر میری بیوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھی اور میں ایک ایسے مکان کی تلاش میں تھا جس کے پڑوس میں ہمدرد اور غمگسار لوگ بستے ہوں کہ میں جب

گھر سے باہر ہوں یا دورہ پر ہوں - وہ میرے تین بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ اس شہر میں میرے کوئی رشتہ دار نہ تھے جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے۔

ڈاکٹر سعدی کے شہر میں آکر دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا ملی اور وہ پھر سے دہکنے لگیں۔ ان چار برس میں میرا اُس سے مکمل قطع تعلق رہا۔ وہ نہ جانے کہاں ہوگی؟ شاید انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ ممکن ہے اُس کی شادی ہوگئی۔ اسی قسم کے خیالات ذہن میں آتے رہے۔

میں ہر روز شام کو مکان کی تلاش میں نکلتا اور ناکام لوٹتا۔ ایک پراپرٹی ایجنٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ "گلنار کالونی" میں ایک صوفیانہ کوٹھی نما مکان خالی ہے اور مالک مکان نہایت نیک انسان ہیں۔ چنانچہ میں اتہ پتہ پوچھ کر اُس طرف روانہ ہوا۔

"گلنار کالونی" میرے لئے کوئی نیا نام نہ تھا۔ اسی کالونی میں ڈاکٹر سعدی کا چار کنال کا پلاٹ تھا۔ جو اُس کے والد نے اس کے لئے برسوں پہلے خرید لیا تھا۔ ڈاکٹر سعدی کا اسی کالونی میں اپنا کلینک کھولنے کا پروگرام تھا یعنی نئے مکان کے ساتھ ہی کلینک بھی۔

دفورِ اشتیاق سے کار خود بخود تیز چلنے لگی کالونی میں داخل ہوتے ہی مجھے سڑک کے کنارے ایک ضعیفہ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھی نظر آئی دونوں نہایت غریب لگتے تھے میری کار آگے نکل چکی تھی۔ چنانچہ میں پیچھے آیا اور انھیں "لفٹ" لینے کو کہا تو وہ دونوں حیران ہوگئیں۔ ضعیفہ بولی "بیٹا یہاں سے کئی موٹریں نکل گئیں کسی کو ہم پر ترس نہ آیا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ بڑی بیمار ہے۔ چلا تک نہیں جاتا۔"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں تو میں نے اُن سے اُن کی منزل پوچھی، بڑھیا نے کہا "ہمیں ڈاکٹر سعدی کے ہسپتال جانا ہے۔"

خوشی سے میرا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا ہسپتال کہاں ہے۔"

"میں بتلاتی ہوں۔ آپ سیدھے چلیں اور پھر دائیں کو مڑ جائیں۔ پہلی ہی کوٹھی میں اُن کا ہسپتال ہے۔"

اور میں چند منٹوں میں منزل پر پہنچ گیا۔

راستے میں میں نے ضعیفہ سے ڈاکٹر سعدی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "نہایت رحمدل ڈاکٹر ہے۔ غریبوں سے فیس نہیں لیتی بلکہ اپنی جیب سے امداد کرتی ہے۔ اسکے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ امیر غریب سب سے ہنس کر بات کرتی ہے۔ اُس کی مسکراہٹ سے ہی آدھا مرض دور ہو جاتا ہے۔"

اور مجھے اس کی مسکراہٹ یاد آگئی جس نے مجھے اُس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ ابھی ضعیفہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک سادہ سی کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"ڈاکٹر سعدی کا کلینک۔"

میں نے کوٹھی میں کار ٹھہرالی اور دونوں خواتین اُتر گئیں۔ بڑھیا نے مجھے دعائیں دیں اور اپنی بیٹی کو کمر سے تھامے برآمدے کی طرف جانے لگی۔

برآمدہ مریض عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں سامنے والے لان میں بھی تھیں۔ میں نے دو منٹ کوٹھی کا جائزہ لیا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ کہ پراپرٹی ایجنٹ کا بتلایا ہوا مکان ڈھونڈوں حسنِ اتفاق سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے وہ مکان مل گیا۔ برابر والی کوٹھی مالک مکان کی تھی۔ اُن سے ملا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر مکان حاصل کر لیا۔ دوسرے دن میں اُس مکان میں منتقل ہو گیا۔

ڈاکٹر سعدی میرے مکان سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پڑوس واقعی اچھا تھا اور مالک مکان نہایت مشفق اور ہمدرد۔ میرے بچوں کا اُن کے ہاں آنا جانا

ہو گیا اور وہ نئے ماحول میں گھل مل گئے۔

مگر میرا اطمینانِ قلب چھن چکا تھا۔ کئی دن اسی الجھن میں رہا کہ ڈاکٹر کے یہاں حاضری دوں یا نہیں۔ نہ جانے وہ کیسے ملے؛ چار سال بعد تو وہ بالکل اجنبی ہو گئی ہوگی۔ آخر ایک سہ پہر جی کڑا کر کے میں اس کی طرف چل دیا اس خیال سے کہ شام کو مریضوں کی یورش کم ہو گی اور شاید ملاقات کا موقع مل جائے۔ خشک سہ پہر تھی۔ یہی پانچ ساڑھے پانچ کا وقت ہوگا۔

وہاں عورتوں کی وہی بھیڑ بھاڑ پائی۔ ایک نرس باہر آئی تو اُسے میں نے اپنا کارڈ تھما دیا۔ پوچھنے لگی "کیا کوئی مریض ساتھ لائے ہیں"۔

عرض کی — "نہیں"۔

"تو پھر کیا کام ہے؟"

"یونہی ملنا ہے"۔

"پہلے سے وقت لے رکھا ہے؟"

"جی نہیں"۔

"تو پھر وہ نہیں مل سکتیں۔ بیحد مصروف ہیں"۔

"آپ انھیں میرا کارڈ تو دیدیجئے"۔

"مجھے سخت ہدایت ہے کہ بغیر کسی خاص کام کے کسی ملاقاتی کو اُن سے نہ ملواؤں"۔

"آپ میرا کارڈ اُن کے سامنے تو رکھ دیجئے"۔

"مجھے ڈانٹ پڑے گی"۔

"میرا ذمہ ڈانٹ نہیں پڑیگی"۔

"کیا آپ انکے عزیز ہیں؟"

"وہ مجھے بیحد عزیز ہیں"!

ابھی نرس غالباً کچھ اور کہتی کہ برابر کے جالی دار دروازوں والے کمرے سے آواز آئی —

"جمیلہ!" اور نرس اندر چلی گئی مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی مگر میں کچھ فیصلہ نہیں کرسکا۔ نرس فوراً باہر آئی اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اسکے پیچھے برآمدے برآمدے چل پڑا اور اور اس نے مجھے الگ چھوٹے سے کمرے میں بٹھادیا جو جالی دار دروازوں والے کمرے کے عین مقابل تھا۔ نرس مجھے بٹھاکر چلی گئی۔ اور میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ چار کرسیوں کے درمیان ایک تپائی جس پر صاف ستھرا سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کوئی خاص سجاوٹ نہیں تھی۔ کرسیوں کے نیچے ایک معمولی مگر صاف دری تھی اور پردے گہرے نیلے تھے۔ تپائی پر چند رسالے پڑے تھے جو سب کے سب ڈاکٹری کے موضوع سے متعلق تھے۔ میں نے وقت کاٹنے کیلئے ایک رسالہ اٹھالیا۔ مگر مضامین میری سمجھ سے باہر تھے۔

کوئی بیس منٹ بعد گہرا نیلا پردہ ہلا اور سعدی کھٹاک سے اندر آگئی۔ سفید لمبا کوٹ، اس پر سٹیتھو سکوپ، چہرے پر وہی سنجیدگی، کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھے سلام کیا اور دیر سے آنیکی معافی چاہی، میں نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا اور پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

چند لمحے سکوت رہا۔ پھر اس نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے بھی مشینی انسان کی طرح ہاتھ اٹھالئے۔ اسکے لب ہلتے رہے اور میں اسے دیکھا کیا۔

پھر وہ بولی۔ "آپ کی اہلیہ کے انتقال کا سن کر مجھے بیحد دکھ ہوا تھا۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ "تو آپ نے میری بیوی کیلئے دعائے مغفرت کی ہے۔"

وہ خاموش رہی اور میں حیران کہ اسے میری بیوی کے انتقال کے بارے میں علم کیسے ہوا۔ نہ میری اس سے خط وکتابت رہی، نہ وہ میرے کسی رشتہ دار کو جانتی ہے، کسی دوست کو۔ بہرحال میں نے اس موضوع پر اس سے کوئی سوال نہ کیا۔

"بچوں کی دیکھ بھال کون کررہا ہے؟"

"کوئی نہیں ــــ اللہ پر بھروسہ ہے۔"

"آپ ایک مہینے سے یہاں ہیں۔ ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"اول تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی، دوسرے مکان کی پریشانی رہی۔"

"اب تو مکان مل گیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"اور یہاں قریب ہی!"

"جی ہاں۔"

"بچّوں کو میرے ہاں بھیجدیا کریں۔"

"جی؟"

"جی ہاں۔ بچّوں کو میرے ہاں بھیجدیا کریں۔"

"میری پڑوسی خواتین بہت نیک ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی ہیں۔"

"آپکی مرضی۔ اگر میں بھی تو آپکے پڑوس میں ہوں۔"

میرا جواب سنے بغیر وہ اُٹھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پیچھے ہو لیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھی کے عقب میں لیجا کر کھڑی ہو گئی۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ سرد ہوا جسم کے آر پار ہو رہی تھی قریب ہی ایک مسجد سے موذن نے مغرب کی اذان دی۔

وہ اذان ختم ہوتے تک خاموش کھڑی رہی۔ دھندلکے میں اُس نے انگشت شہادت سے اپنی کوٹھی سے ملحقہ خالی قطعۂ زمین کیطرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا: "یہ رہی آپ کی ایک کنال زمین ــــ"

میں جیسے منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔

میں فقط ایک سایہ کوٹھی کے برآمدے میں سماتا ہوا دیکھ سکا۔

اس مرتبہ اس نے جاتے ہوئے سلام بھی نہ کیا۔

کلام حیدری

سخی

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے، جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں، وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوئے ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے، میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے، کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، یہ میں نہیں جانتا، یہ کیا کرتا ہے، یہ بھی میں نہیں جانتا، یہ منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے، صرف یہ میں جانتا ہوں ـــــ بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین بیڑی دکان، پورنیہ ـــــ

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگالی ہے، اور بالائی ہونٹوں سے اُلجھ رہی ہے، میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ، ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اُترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی

لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھوا سکتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لئے اس کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا — "معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجئے۔" چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

اور میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھالی ہے اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج ہوگی۔ میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے اور میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے، جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے، آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلاہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رُک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایک کے سر پر "دلی والوں" جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال اُلجھے اُلجھے ہیں اور دونوں پھر اندر آجاتے ہیں۔

اور میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سُنا رہا ہے اچانک وہ زور سے کھڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھوڑی ہاتھوں پر رکھے کسی اُردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا۔ چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔
'دُرزن' والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیرمال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچیخانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔
اور مولابخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے، جیسے اُسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو، میں اسکی ٹٹولتی نگاہوں سے بچکر پہلو بدلتا ہوں۔
اور اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اُس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی بس کرن کے سہارے میں نے تین روپئے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی، اب وہ ایڈیٹر نہیں آیا۔ جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں، میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ سکوں۔
دُرزن والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیرمال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سُرخی مائل حصّہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اُٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔
وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے، اور میں سوچ رہا ہوں، مولابخش کی بیوی سکینہ کیسی ہو گی؟ اور اُس کے کوئی بچّہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولابخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں کہ اسکے کوئی بچّہ ہے یا نہیں۔
میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دلی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اُس کا ساتھی آدھی سے زائد شیرمال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اُٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا، اور میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیے ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی، آفسوں کے چکر لگائے جا سکتے تھے، دکانوں کے کج خلق مالکوں سے نوکری کی درخواست کی جا سکتی تھی، کوئی ٹیوشن ہی تلاش کیجا سکتی تھی، مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچّہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا، اور تب میں سوچتا ہوں، یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار وغیرہ ہوگا یا پھر دوست ہو سکتا ہے اور سکینہ......

اب یہ کیا تک ہے کہ ایڈیٹر وعدہ کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے، شرافت حسین اور سکینہ کی رشتہ داری کی نوعیت کی فکر ہے، مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیرمال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں، اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کرنے کے بعد میں نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی ۱۳ تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے، ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی۔ اور یہ جو نور لائن کی آنکھوں میں چمک ہے وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلاہٹوں میں

ہے وہ فراق یار ہے۔

تین روپئے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جدا ہوجانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا —— سوچ رہا ہوں یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کرچکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل پر سے اُٹھایا نہیں ہے، تو یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کردیگی اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر، اور یہ زکریا اسٹریٹ، اور یہ دلکشا ہوٹل۔

دل سے انتہا ہوگا مولابخش سکینہ کو جبھی تو۔

اور اب مولابخش اپنی جگہ سے اُٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور اب وہ میرے قریب آگیا ہے اور کہہ رہا ہے" ہم کل آئینگے جی —— آپ رہیں گے نا؟ ——"

میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا....

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوا ہوں، میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیہ سے دبے پڑے ہیں اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی سی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے جس پر ایک امریکن عورت ہوائی جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے میں امریکن کلینڈر ... میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں، بھوک لگ رہی ہے، بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ ڈوری پر ٹنگا ہوا پینٹ پہن لیتا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا، کچھ سہارا ہو جائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا اور تب سوچتا ہوں انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں۔

اور میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے اور میں اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں، بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین بیڑی دکان۔ پورنیہ۔ مولا بخش معرفت.... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ رہا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ساتھ ہی کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آگیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے اسلئے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا اور میں کچھ سوچکر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے، وہ کہے تو میں منی آرڈر لگا دوں۔

"آپ ——؟" وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے، ایک کام ہی اُسکا کر دوں گا تو چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپئے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہو گئی ہے اور میں دل کشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال، قورمہ اور سیخ کباب لاکر رکھا ہے اور میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آرہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اُس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اور اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے، کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی اور دفعتہً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا

ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا ساٹھ روپئے میری جیب میں پڑے ہیں اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سینما کے سامنے پڑے ہوئے بینک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دئے ہیں۔

میں شیرمال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپئے مانگ لیتا تو شاید وہ دیدیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلّت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اُتر رہا ہوں، پانچویں منزل سے اُترتے اُترتے پاؤں دکھنے لگے ہیں اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن دور کر رہا ہوں۔ میری جیب میں بائیس روپئے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے بائیس روپئے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپئے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رخ کولو ٹولہ کی طرف کر دیا ہے، چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آگیا ہوں جو جاپانی بم باری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آگیا ہوں جہاں اُردو رسالوں کی دکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ سکینہ کا خیال مجھے آتا ہے، پھر مجھے اس کوٹھی کا خیال آتا ہے جو تھیٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لئے آج شام کو بلایا گیا ہے۔ کیا پتہ آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے، وہی زکریا اسٹریٹ اسکے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔

"ایک غریب مرگیا ہے، کفن دفن کیلئے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجئے۔"

میں قریب جاتا ہوں، میں چونک جاتا ہوں، میں پھر قریب جاتا ہوں — فیتے سے بند ہونیوالی گنجی، ایک کان کی کٹی ہوئی لو۔

مولا بخش — ؟ میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں۔ سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں یہ کیسے مرا۔ "ٹرک سے کچل کر"۔ نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے۔ ناخدا مسجد ہے۔ مولا بخش ہے، جس کے کفن دفن کے لئے ایک آنے، دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپئے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ایک محبت سَو افسانے

ٹیمی شا، کی خوش وقت سنگھ سے شادی کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ چرچا ہی نہیں بلکہ تشویش تھی کہ اس کی وجہ سے حالات خطرناک ہو جائیں گے۔ شہر کی مختلف انجمنوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس کے خلاف اقدامات کرنے کی دھمکی دی تھی۔ وہ اسے اپنے اپنے مذہب کے لئے خطرہ اور اپنے لئے باعثِ توہین سمجھ رہے تھے۔ جمہوریت اور سیکولر حکومت میں ہر ایک کو من مانی آزادی تھی۔ یہ انجمنیں اسی آزادی سے شہر میں جلسے کر رہی تھیں اور جلوس نکالنے کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔

اخباری نمائندے کی حیثیت سے میں نے کوشش کی کہ ٹیمی شا سے انٹرویو لے سکوں اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا ـــــ میرا اخبار اس انٹرویو کی روداد شایع کرکے اپنی شہرت میں اضافے کی راہ دیکھ رہا تھا۔

انٹرویو کے لئے میں جب سر احمد کی کوٹھی پر پہنچا تو ایک ملازم نے میرا نام پتہ پوچھ کر مجھے ان کے ملاقات کے کمرے میں بٹھایا۔ کمرے کی تزئین و آرائش بڑی نفاست سے کی گئی تھی۔ قالین بڑے قیمتی تھے۔ پردے خوب صورت اور دیواروں پر لگی ہوئی ہاتھ سے بنی ہوئی تصویریں بڑی نظر فریب اور جاذبِ توجہ تھیں ـــــ ڈرائینگ روم میں پرانی طرز کی انگیٹھی تھی جس میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور انگیٹھی سے دوسری طرف

ریڈیو گرام تھا۔

میں کمرے کا جائزہ لینے ہی میں محو تھا کہ ملازم کافی لے کر آ گیا۔

"سر احمد نے بھجوائی ہے۔ بٹیا ابھی آ رہی ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "اتنے میں آپ کافی سے شغل کیجئے۔"

ننھے سے کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے میں نے کارنس پہ رکھی ہوئی تصویروں پر نظر کی۔ سکرٹ میں ملبوس، بالوں میں ربن لگائے ایک ننھی سی لڑکی ہنس رہی تھی۔ اس کے خوب صورت دانت اور شوخ مسکراہٹ، زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اس پہ سے ابلی پڑ رہی تھی۔ اس سے ذرا دور نیکر اور بنیان میں ریکٹ تھامے ایک دوشیزہ تھی جو ایک زندگی سے بھرپور جوانی کا مظہر تھی ــــ میں نے غور سے دیکھا، دونوں ایک ہی لڑکی کی تصاویر معلوم ہوئیں۔

میں ابھی ان تصویروں کو دیکھنے ہی میں مگن تھا کہ سُریلی نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"شب بخیر۔"

"بخیر!" کہتے ہوئے میں تعظیماً اُٹھا۔ میں نے نظر اُٹھائی تو ایک نہایت ہی باوقار اور خوب صورت خاتون کو سامنے پایا۔ سفید ساری میں ملبوس، نئے فیشن کے ترشے ہوئے بالوں میں افشاں چمک رہی تھی، مانگ میں سیندور، ماتھے پر سُرخ رنگ کی بندیا، کانوں میں جھلملاتے ہوئے آویزے جن میں زمرد دمک رہا تھا۔ لمحہ بھر تو میں گویا مبہوت ہی رہا۔

"تشریف رکھئے!"

"جی میں!"

"ارے آپ تشریف تو رکھیں، آپ آٹھ میل کا فاصلہ طے کرکے تشریف لائے ہیں۔ کافی پیجئے ــــ!"

"تو فرمایئے انور صاحب۔" اس نے میز کے دوسری طرف کرسی کھینچ کر اس پہ بیٹھتے ہوئے

یوں کہا جیسے انٹرویو کے لئے میں نہیں وہ تشریف لائی تھیں۔

"جی میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تھا، امید ہے آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔۔۔۔ !"

"جی نہیں اعتراض ہوتا تو آپ کو وقت ہی نہ دیا جاتا۔ آپ پہلے اور آخری آدمی ہیں جنہیں اس بات کی اجازت ملی ہے۔ اس کے بعد تو ڈیڈی نے حالات کا رُخ دیکھتے ہوئے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا ہے۔"

"بڑی مہربانی !"

"مہربانی کی کوئی بات نہیں محض اتفاق ہے !"

"حسنِ اتفاق کہئے۔" میں نے کہا۔

اور وہ مسکرا دیں۔

"ہاں تو میں اس وقت ایک بڑے ہی ذاتی معاملے پر آپ سے کچھ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"جی میں سمجھ گئی ہوں۔"

"تو فرمائیے، اس واقعے کو جس نے شہر بھر کو بلکہ ملک بھر کو چونکا دیا ہے ۔۔ کیسا اتفاق سمجھنا چاہیئے۔"

"مجھے اس سے اختلاف ہے میں اسے قطعاً اتفاق نہیں سمجھتی، یہ کوئی لوایٹ فرسٹ سائیٹ (Love at first sight) والا معاملہ نہیں بڑا سوچا سمجھا فیصلہ ہے!"

"کیسے! ذرا اس پر مزید روشنی ڈالئے گا، آپ خوش وقت کو کب سے جانتی ہیں؟"

"روشنی تو میں ضرور ڈال دیتی مگر یہ آپ نے ٹیڑھا سا سوال کر دیا کہ میں خوش وقت کو کب سے جانتی ہوں، یہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ میں اپنے بچپن کے پہلے کی باتیں نہیں جانتی۔ میرے ڈیڈی اور خوش وقت کے پاپا پرانے دوست تھے۔ دونوں مدتوں ساتھ رہے

ہیں۔ دونوں خاندانوں میں ایک زمانے سے دوستانہ بلکہ برادرانہ میل جول ہے۔ خوش وقت کی ممی اس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھیں۔ میں نے بچپن میں ہمیشہ ہی اسے اپنے گھر دیکھا۔ اسکول کے بعد کا بیشتر وقت وہ ہمارے ہاں ہوتا۔ ہماری ممی اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ اس کا کھانا چائے اکثر ہمارے ہاں ہی ہوتا۔

"اکثر گرمیوں کی دوپہروں کہ جب بزرگ سورہے ہوتے، ہم نے باغوں میں مِل جُل کر چوریاں کیں۔ اپنے صحن میں لگی بیری سے پکّے پکّے میٹھے بیر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نیچے گرا گرا کر اکٹھے کر کے جھولیاں بھری ہیں یا سرکنڈوں کی کھوٹیاں بنا کر پکّے پکّے بیر چُپکے چُپکے اُڑا لئے ـــ اور کبھی "پٹ پٹ پٹیلو" کھیلی ہے۔ مجھے اب بھی یاد ہے، ایک بار خوش وقت کے پاپا نے کہا تھا۔

"احمد! یار تم لڑکے کو مسلمان نہ بنا لینا"

"مطمئن رہو نواب سنگھ، ایسا نہیں ہوگا ـــ" اور پھر ہنس کر کہنے لگے۔ نواب سنگھ، میں کوئی ایسا بُرا آدمی ہوں ؟"

"نہیں احمد بھائی" اُنھوں نے کہا ـــ تو ڈیڈی نے کہا تھا "پھر تمھیں کس بات کا ڈر ہے !"

"ڈر تو کوئی نہیں، میں تو یوں ہی بات کر رہا تھا۔"

میں بڑے انہماک سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ بڑے میٹھے اور دھیمے لہجے میں ماضی کی اس کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے ورق اُلٹ رہی تھی۔ میں اس کے جذبات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات یا ہیجان نہ تھا۔ میں نے سُنتے سُنتے یوں ہی کہہ دیا۔ "مگر ٹیمی شا، یہ تو بچپن کی باتیں ہیں ـــ !"

"لِٹ می کوَرکٹ یو ـــ ٹیمی شا نہیں، ٹیمی خوش وقت، جس بات کا سارا جھگڑا ہے، اسی کو آپ نظر انداز کر رہے ہیں !"

"جی، آئی ایم سوری مسز خوش وقت ـــ !"

"اسکول کے بعد کا زمانہ، اس میں کچھ ملنا جلنا کم ہو گیا۔ کھیل کود کم ہو گئی۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا، کچھ مشاغل میں تبدیلی آگئی ـــــ پھر جب ہم کالج میں دوبارہ اکٹھے پڑھنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے بغیر میں کچھ خلا سا محسوس کرتی ہوں۔ جب وہ قریب ہوتا تو گویا کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوتی اور جب نہ ہو تو جیسے ہر چیز میں، ہر بات میں ایک غیر محسوس سی نامعلوم سی کمی!

"کالج میں ہم اور قریب آگئے۔ ہماری دلچسپیاں ایک سی تھیں۔ شاید اس لئے کہ ہماری تربیت ایک ہی ماحول میں ہوئی تھی ـــــ کالج میں ٹینس اور رونگ ہماری کمزوریاں تھیں اور پھولوں کے ہم دیوانے تھے۔ سالانہ کھیلوں میں اکثر ٹینس اور رونگ فائنلز میں ہمارے نام ہوتے اور کالج کی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے پہلے عہدے دار ہم ہی ہوئے۔ ہم نے پڑھائی کے کتنے ہی اوقات کالج کے آرچرڈ میں گوڈائی کرتے، بیج بوتے اور ان کی آبیاری کرتے ہوئے بقول لوگوں کے ضائع کر دئے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں کیاریاں بنائیں اور پھر منتظر اور بیتاب آنکھوں نے ان میں خوش رنگ پھولوں کو آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا اور پھر ان رنگوں کی کشش سے کھنچ کر آئی ہوئی حسین، خوش رنگ تتلیوں کے پیچھے نیٹ لے کر بھاگتے پھرے!

"قدرت نے کس فیاضی سے پھولوں کو، تتلیوں کو رنگ دئے ہیں" خوش وقت نے ایک بہت ہی خوب صورت تتلی کو اپنی Collection میں لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں پگلے!" میں نے اس سے کہا تھا۔ ان دنوں میری اس کی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ "سب کہاں کچھ لالہ دگل میں نمایاں ہو گئیں!"

"اور یوں یہ دوستی روز بروز پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی۔ ہمارے ولایت کے قیام کے دوران یہ اور بھی مضبوط ہو گئی ـــــ وہاں لوگوں کے مشاغل اور تھے اور ہمارے کچھ اور۔ خوش وقت ایک طرح سے ہمارے ہی گھر پلا تھا۔ وہاں بھی اسی روش پہ رہا۔

نہ شراب، نہ نائٹ کلب، نہ ڈانس۔ ہم نے وہیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہماری منزل ایک ہے۔ ہم عمر بھر ایک ساتھ رہیں گے۔"

"مگر مذہب کے اختلاف کو کبھی آپ نے اس رستے میں رکاوٹ محسوس نہیں کیا؟"

"یہ بات کچھ دیر کے لئے ہمارے ذہنوں میں آئی تو! کبھی ہم نے یہ بھی سوچا کہ اس فرق کو کیسے دور کریں۔ خوش وقت میرا مذہب اختیار کر لے یا میں اس کے مذہب میں شامل ہو جاؤں — اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ میں نے خوش وقت سے کہا مگر وہ بڑا ہی آئیڈیلیسٹ قسم کا آدمی ہے۔ اس نے کہا۔ "تہمینہ، اس سے کیا فرق پڑے گا۔ نہ تم کبھی مسجد گئی ہو نہ میں کبھی گوردوارے اور مندر — جو تم کھاتی ہو وہی میں کھاتا ہوں۔ جس قسم کا لباس تمہارے لوگ پہنتے ہیں وہی میں پہنتا ہوں۔ میں تمہارے ہی گھروں میں پلا بڑھا ہوں۔ میرے کردار پر اپنے گھروں کی چھاپ ہے۔ جن چیزوں کا تمہیں شوق ہے وہی مجھے بھی اچھی لگتی ہیں۔ جو باتیں تمہیں ناپسند ہیں مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جیسے تم سوچتی ہو وہی میری سوچ کا رنگ ہے۔ جس طرح سے تم لوگ رہتے سہتے ہو اسی طرح ہم۔ جو زبان تم بولتے ہو وہی میں — نام تبدیل کر لینے میں ہرج تو نہیں مگر فائدہ بھی کیا۔"

"اچھا میں نام بدل لیتا ہوں" خوش وقت نے ایک دن کہا۔ "مگر شراب شروع کر دوں گا۔ آدھی رات کے بعد تک نائٹ کلبوں میں رہوں گا۔ واہیات لڑکیوں کے ساتھ پھروں گا۔ پھر۔!"

"نہیں خوش وقت ایسا نہیں ہوگا!"

"کیسا نہیں ہوگا!"

"یہی کہ تم یہ سب نہیں کرو گے۔ ہم اسی طرح ایک دوسرے کے ہو جائیں گے!"

"اور جب ڈیڈی نے یہ سوال اٹھایا تو یہی باتیں میں نے اُن سے کہہ دیں۔ ڈیڈی بظاہر لاجواب سے ہو گئے۔ شاید مطمئن!

"پھر بھی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیال ضرور رہی ہوتا ہے۔ اعتقادات

کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں!" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں"، ٹیمی ساری سنبھالتے ہوئے اُٹھی اور ایک تصویر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تصویر کی طرف متوجہ رہی، پھر مُڑی اور قریب آکر بڑے انداز سے کہنے لگی ——— "جی اور اعتقادات عمل ہی سے مترشح ہوتے ہیں۔ اگر خوش وقت نام بدل لے تو شاید کوئی شور وغوغا نہیں کرے گا ——— !"

اور پھر وہ خاصی دیر اعتقادات اور عمل کے باہمی تعلق اور روزمرّہ کی زندگی میں مذہب کے دخل پہ بحث کرتی رہی اور اس کا انداز کچھ اتنا مُدلّل اور موثر تھا کہ میں سمجھا کہ خوش وقت نہیں وہ ولایت سے قانون کی ڈگری لے کر آئی ہے!

——— اور اگلے دن جب شہر کے اخباروں میں ٹیمی اور خوش وقت کی شادی کے خلاف مذہبی انجمنوں کے لیڈروں اور سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے بیانات اور تاثرات شایع ہوئے۔ میرے اخبار میں اس خصوصی انٹرویو کی موٹی موٹی باتیں چھاپی گئیں اور اشتہار دیا گیا کہ مکمّل انٹرویو اگلے دن شایع کیا جائے گا۔

مختلف سماجی انجمنوں نے اخبار کے مالکوں پر زور دیا کہ اسے نہ چھاپا جائے۔ اس سے اختلافات بڑھیں گے۔ فضا زیادہ مکدّر ہو جائے گی ——— مگر یہ ہمارے اخبار کی خصوصی اسٹوری تھی اور یہ ہماری بہت زیادہ پبلسٹی کا موجب ہو سکتی تھی ———

اگلے دن اخبار ہاتھوں ہاتھ بک گیا بلکہ شام کو اور زیادہ اخبار چھاپنا پڑا۔ لیکن اس دن شہر میں اس شادی کی مخالفت میں جلسوں جلوسوں میں اخبار کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ بلکہ دو ایک جگہ اخبار کو جلایا بھی گیا ———

مگر جلی حروف میں چھپی ہوئی یہ کہانی ہر شخص تک پہنچ گئی اور گرما گرم بحث کا موضوع بن گئی۔

——— اور پھر مختلف مذاہب کے لوگ جو ایک ہی بات کی مخالفت کے لئے نکلے تھے

آپس میں اتفاق کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے اور شہر میں چاقو زنی کی پہلی واردات فساد کی بنیاد بن گئی۔

اور پھر یہ فساد بڑھتا ہی گیا۔ ایک جگہ ایک فرقے کے آدمی کو دوسرے فرقے والوں نے مار دیا تو دوسری جگہ دوسرے فرقے والوں نے مخالفوں کے مکانوں کو آگ لگادی۔ اور اسی طرح یہ فسادات محلّے محلّے اور پھر شہر شہر پھیلنے لگے۔

جو لوگ اس واقعے کو ہوا دے کر فسادات کا موجب ہوئے تھے۔ اب بیانات دے رہے تھے کہ مختلف فرقوں کو صلح و آشتی سے آپس میں مل جُل کر رہنا چاہئے۔ جو لوگ فسادات کا موجب تھے اب ان وارداتوں کو ناپسندیدہ اور افسوسناک قرار دے رہے تھے۔ اخبارات میں شہ سرخیاں اور شہ سُرخیاں جم رہی تھیں۔ اخبارات کی اشاعت کافی بڑھ گئی تھی اور بڑھ رہی تھی۔

جب سرکاری خبروں میں درجنوں آدمیوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کی خبر دی گئی تو غیر سرکاری اور افواہی خبروں میں یہ تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔ سر احمر کے گھر پر پتھراؤ کیا گیا، اسے آگ لگانے کی کوشش کی گئی، مکان کے ارد گرد پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا —— ٹیمی اور خوش وقت پہلے ہی انتہائی راز داری سے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔

مگر فسادات تھے کہ تھمنے ہی میں نہ آرہے تھے۔ شہر شہر وارداتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ مر رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا اور کیوں کر ختم ہو سکے گا۔ کہ ایک دن دفتر میں مجھے سمندر پار سے ایک ٹیلیفون ملا —— آواز سُنتے ہی میں پہچان گیا کہ کون ہے ——

"انور صاحب! میں ٹیمی بول رہی ہوں! آپ اپنے اخبار میں میری طرف سے ایک بیان شایع کر دیجئے۔"

"تو بہ کیجئے" میں نے کہا ۔ "پہلے ایک انٹرویو شایع کیا تھا ۔ ابھی تک میں اس چکّر سے نکل سکا ہوں نہ ملک !"

"یہ اسی چکّر سے نکالنے کے لئے ہے !"

"بہتر، یہ بات ہے تو فرمائیے ۔ !"

"مجھے اور خوش وقت کو فسادات کی خبریں بڑی دیر سے ملی ہیں ۔ ہمیں ان فسادات پہ گہرا افسوس ہے جن میں معصوم جانیں ضایع ہو رہی ہیں ۔ بے گناہ مارے جا رہے ہیں ۔ محبت دلوں کو جوڑنے کا نام ہے، اسے فسادات کا موجب نہیں بننا چاہئے ۔ اس بات نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے ۔ ہم بے گناہوں کا خون بہتا نہیں دیکھنا چاہتے ۔ ہماری محبت اتنے بڑے کفارے کی متحمل نہیں ہو سکتی ـــــ لہٰذا ہم نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ تحریری بیان میں بھیج چکی ہوں، جلد آپ کو مل جائے گا ۔"

اور اگلے دن میں نے جلی سُرخی سے یہ خبر اپنے اخبار میں شایع کرا دی ۔

جلتی ہوئی آگ پہ جیسے پانی کے چھینٹے پڑ گئے ۔ فسادات مدھم ہو گئے ـــ اور پھر رُک گئے ۔

سماجی، مذہبی اور سیاسی انجمنیں ٹمی اور خوش وقت کی عقل مندی، قربانی اور کردار کی بلندی کے گُن گانے لگیں ۔ انہیں ملک واپس آنے کی دعوتیں ملنے لگیں ۔ بہت سی لڑکیوں اور بہت سے لڑکوں نے انہیں اپنا ہیرو سمجھ کر ان سے تصاویر طلب کیں ۔ ان کی ڈاک روز بروز بڑھنے لگی ۔

اور آخر کچھ عرصے بعد وہ ملک واپس آ گئے ۔ لوگوں نے ان کا پُرجوش استقبال کیا، ہار پہنائے، جلوس نکالنے کی کوششیں کیں، اخباروں میں ان کی تصاویر ایک بار پھر مختلف عنوانات کے تحت چھاپی گئیں ۔ ان کے شخصی اور خاندانی حالات چھپے ۔ ان سے انٹرویو لینے کی کوششیں کی گئیں مگر انھوں نے سب کو ٹال دیا ۔

اب وہ علیحدہ علیحدہ رہ رہے تھے۔ اب لوگ ان کی مایوسیوں اور دل گرفتگی کی داستانیں لے اُڑے۔ مگر آخر آہستہ آہستہ خاموش ہو گئے۔

مگر ایک دن اس خبر نے سب کو چونکا دیا کہ ٹمی اور خوش وقت نے خودکشی کرلی ہے۔ دونوں نے کہا تھا کہ بے گناہوں کی جانیں بچانے کے لئے ہم نے محبت کی قربانی دی تھی۔ مگر محبت کے بغیر زندگی بے کیف سی چیز ہے۔ لہذا ہم نے محبت کے لئے زندگی کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا ہے ۔۔۔!

مذہبی، سماجی اور سیاسی انجمنوں کے ۔۔ یداروں سے میں نے ان کا ردِ عمل معلوم کرنے کی بہت کوشش کی مگر کسی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا!

ن۔م۔راشد

لا۔ انسان

ہمیں یاد ہے وہ درخت جس سے چلے ہیں ہم
کہ اُسی کی سمت (ازل کی کوریٔ چشم سے)
کئی بار لوٹ گئے ہیں ہم
(میں وہ حافظہ جسے یاد مبدا و منتہا
جسے یاد منزل و آشیاں)
اُسی اک درخت کے آشیاں میں رہے ہیں ہم
اُسی آشیاں کی تلاش میں
ہیں تمام شوق، تمام ہو
اُسی ایک وعدۂ شب کی سو
ہیں تمام کاوشِ آرزو!
یہ خلائے وقت کہ جس میں ایک سوال ہم
کوئی چیز ہم، نہ مثال ہم
جسے نوکِ خار سے چھید دیں
وہی ایک نقطۂ خال ہم
(میں وہ حادثہ، جو ہزار حادثوں کی طرح
ہو اسیر حلقۂ دامِ جاں
جو اسیر ہو، مگر اور ایسے ہی حادثوں
کی طرح رواں دواں

اُسی ایک وعدۂ شب کی سُو!
مری ایک جنبشِ چشم تک
کئی حادثات کا سلسلہ
نہیں جن میں لمحے کا فاصلہ
ہوں اسیر جس میں یہ حادثے، میں وہ حافظہ)
ہمہ تن نشاطِ وصال ہم
مگر آشیاں کے بغیر وہم و خیال ہم
ہیں رواں، کہ مِل کے زباں بنیں
کوئی داستاں، کوئی نغمہ، کوئی بیاں بنیں
ہے مگر یہ خطرہ پَے بہ پَے کہ یہ جستجوئے عظیم بھی
نہ کہیں ہو رازِ تلاشِ منزلِ جستجو،
کہ یہ جانتے ہیں، نہیں ہیں اپنا مآل ہم
کبھی موقلم، کبھی پردہ ہم
کبھی خط ہیں اور کبھی خال ہم
نہیں نقش گر، نہیں نقش گر کا کمال ہم

قاضی سلیم

تقسیم

ہمالہ کے پہاڑوں کی بلندی
بھیگتے پُرپیچ ٹیلے
برف کے صیقل کئے آئینے دھندلاتی
برستی جھومتی بدلی
پھلوں پھولوں کا رس پیتی ہوا
موتی پروتی گھاس، پودے
پر سکھاتے رنگ بکھراتے پرندے

روح کی بالیدگی
آنکھوں کا امرت
پیار کے آنسو
فضائے ماہ و انجم تک تمہاری مملکت ہے

مقدر میں ہمارے
شہر کی گلیاں
مکانوں کی سلگتی کھڑکیاں
دوکان، گاہک، بینک، بازاروں کی گرمی
کارخانوں کی جھلستی چمنیاں
پُرشور ہوٹل
بوتلوں کی آگ
رقصاں گوشت کے پتلے
لہو میں تیرتے بھنتے
سبھی دھرتی کی نچلی سطح کے باسی
تمنّاؤں کے ایندھن ہیں

کہاں ہم اور کہاں فن کار
بارش سے ذرا بچ کر
تمھارے پاس آ بیٹھے
ہمیں جانا ہے ہیکمن[1] کے ڈنر میں
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

[1] مسوری کا مشہور ہوٹل

کرشن موہن

دوہے

اگنی بھڑکے پیت کی، تن من ہے بے چین
اک ہرجائی میت کی یاد آئے دن رین

نس دن من بھرمائے ہے مایا کا انوراگ
دنیا کو تجنا بھلا شیتل ہو یہ آگ

سادھو سنت مہان ہیں اونچا اُن کا یوگ
وہ دھرتی کی جان ہیں اور تن ہیں ہم لوگ

نس دن ڈستا جائے ہے من کو مایا ناگ
کایا کے اِس روگ کو ہم سمجھے ہیں سہاگ

گھر آنگن کی دھوپ میں جسموں کا یہ میل
جس میں بکل آتما ہے اک پیاسی بیل

جادوگر کا کھیل ہے، مایا کا یہ سوانگ
پوری ہوتے ہوتے بھی بڑھتی جائے مانگ

ایک ادھورا کھیل ہے یہ پھیلا سنسار
اجنبیوں کا میل ہے سپنوں کی جھنکار

مستی ہی میں پائے دل ہستی کا عرفان
خواب میں جیسے جائے مل اَن دیکھا بھگوان

سُندر سپنے چاہ کے ہوتے کیوں کم میت
چھوڑ کے جانا راہ میں ٹھہری جگ کی ریت

نین ملے برسات میں دل نے کھائی مات
تب سے برہ کی رات میں اشکوں کی برسات

بلراج کومل

سرخ سورج کا زہر

آنے والے دنوں کے خطرے سے
اس نے گھبرا کے خودکشی کر لی
میں نے اس رات گیت لکھا تھا
موت کا جس میں ذکر تھا شاید
خوفِ فردا کا جس پہ سایہ تھا

آخرِ شب وہ کون آیا تھا؟
میز پہ کچھ پریشاں کاغذ تھے
گیت پڑھ کر وہ کھل کھلا اُٹھا
مجھ سے کہنے لگا: چلو آؤ
شب کا پچھلا پہر حسیں ہوگا
آؤ ہم دونوں سونی راہوں پہ
مرنے والے کی یاد کا سونا
اس کے اوصاف کی حسیں چاندی
صبح سے قبل ڈھونڈھ لیں شاید،
ہم کو گر خودکشی ہی کرنی ہے
اپنے حصے کے آخری پل میں
سرخ سورج کا زہر پی لیں گے

جستجو کی ہر ایک منزل پر،
تنہا ہوتا ہوں، یاد کرتا ہوں،
آخرِ شب وہ کون آیا تھا؟
سرخ سورج کا زہر ہاتھوں سے
کس نے آ کر مجھے پلایا تھا؟

مغنی تبسم

رائگاں

ہاتھ میں یہ قلم وزن رکھتا ہے لیکن یہ میں
کس طرح مان لوں کہ ہمالہ ہے کوہِ گراں
تم سُناتے ہو صدیوں کی تاریخ، میں کیسے باور کروں
جب کہ دنیا مرے ساتھ پیدا ہوئی
"بے خبر!" تم کہو
میں سمجھتا ہوں دورِ زماں صرف احساس ہے
اپنی اپنی شکستوں کا محرومیوں کا گماں
موت کا خوف ہے

اور مکاں ؟
ایک زنداں ہے محبوس جس میں ہیں شام و سحر
روح کے روح سے فاصلے
جسم سے جسم کی دوریاں
دور ہی دور رہتے ہیں شام و سحر
چاند، سورج،
ستارے، زمیں،

دور ہے آسماں
دور ہی دور ہوتا چلا جائے گا
ذوقِ پرواز ہے رائگاں

انتخاب سید

تخلیق

میرے کمرے کے اندھیرے طاق پر رکھی ہوئی
دیمک زدہ میری حیات
گرد کی بھاری تہوں کے جبر کا بارِ گراں
سر پہ اُٹھائے
جانے کتنے راز سینے میں چھپائے
چیختی ہے
روشنائی کے سمندر میں اتر جانے سے پہلے
مجھ کو اپنے زنگ خوردہ قید خانے سے نکال
ایک عالم منتظر ہے!

بیداری

اور کب تک
بلندی کو حسرت سے تکتا رہوں
بادلوں کی طرح تیرنے کی تمنا!
ستاروں کے دل کے دھڑکنے کی آواز
سُننے کی خواہش
کہاں تک کروں
سوچتا ہوں کہ اب
اپنی پستی کی بے رونقی میں ــ تبسم کی کھیتی کروں

سیّد فضل المتین

کہانی

تمہیں کیا سُناؤں
میں اپنی کہانی

"کروڑوں برس کے عمل اور ردِ عمل کی بدولت
زمانے کی گردش نے لمحہ بہ لمحہ
اندھیرے اُجالے میں مجھ کو
بدلتے ہوئے موسموں کی طرح سے
نیا روپ بخشا
نئی زندگی دی

میں صبحِ ازل ہوں، میں شامِ ابد ہوں"

وقت

وقت ایک جادوگر ہے
ڈگر ڈگر پہ
جاگتے سوتے انسانوں کو
چکمے دے کر
اُن کی بھونڈی عقل پہ ہنستا،
کھیل تماشے کرتا
آگے بڑھتا جاتا ہے

شہریار

اور میں

راکھ کا ڈھیر، دھواں، ایک شرارہ اور میں
صبح کی اونگھتی سانسوں کا عذاب
رات کی جاگتی آنکھوں کے سوالوں کا جواب
حاصلِ زیست تمنّا کا مآل
زندگی بھر کے گناہوں کا حساب

خامشی، نیند، سکوں، موت، سراب
خواب، تعبیریں، دُھندلکے، سائے
یاد، تنہائی، فسانے، قصّے
جیسے افسونِ خیال
حاصلِ زیست تمنّا کا مآل
زندگی بھر کے گناہوں کا حساب
راکھ کا ڈھیر، دھواں، ایک شرارہ اور میں

رشید افروز

مایوسی

جلتی سڑکوں سے چل کر
سرد ہوا کا جھونکا
تم سے ملنے آیا تھا!
بھِڑا ہوا دروازہ دیکھ کے
لَوٹ گیا !!

ایک شہر

دُور......
جنگل کے ویران دامن میں
ٹوٹی قبروں کے بے نام پتھر
اپنی خاموش آواز سے کہہ رہے ہیں
ذرا دو قدم اور
اِک شہر ہے !!

رب نواز مائل

جرم

ہاتھ کاٹو
ظلم ڈھاؤ
جنگ چھیڑو
پھر بھی تم گوتم رہو گے پھر بھی تم عیسیٰ النفس
ہاں مگر اک پیار سے
کتراؤ، بھاگو
منزلوں پیچھے رہو
کیونکہ اب تک بستیوں میں پیار کرنا جرم ہے

دو رباعیاں

کامل القادری

احساس کی میزاں پہ نہ اتنا تولو
خمخانۂ معنی ہے زباں تو کھولو
یزدانِ محبت کے رسولِ آخر
ہے گوش بر آواز زمانہ بولو

زلفوں کی گرہ بند قبا کے کھولے
وہ آئے عیادت کو مژہ کو تولے
پھر مہلتِ نظارہ ملی ہے کامل
جب سامنے وہ ہوں تو اجل کیا بولے

ہماری مطبوعات

بچوں کا ادب

جن پر حکومت ہند نے مصنفین کو انعامات دیے

نجومی آپا — اطہر پرویز — ۰/۷۵

مصنوعی چاند — " — ۱/۵۰

خلا کا سفر — " — ۱/۲۵

توانائی کا راز — " — ۱/۲۵

ستاروں کی دنیا — " — ۲/۰۰

بھارت دیس ہمارا دیس — جاوید اقبال — ۱/۰۰

ہماری آباد دنیا — فصاحت حسین — ۱/۰۰

چند ادبی کتابیں

ادب اور زندگی (تنقید) پروفیسر مجنوں گورکھپوری -/۵

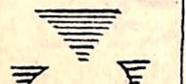
ادب کا مطالعہ (تنقید) — اطہر پرویز -/۵

رقص بسمل (افسانے) — صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/۷۵

دودھ اور خون (افسانے) — صدیقہ بیگم ۲/۵۰

ہولی اور چراغ (ڈرامے) — اطہر پرویز ۲/۶۲

شرابی (ڈرامے) — اطہر پرویز ۰/۶۵



پتھروں کا مغنی

(مجموعہ کلام)

قیمت -/۶

وحید اختر

"وحید اختر کے کلام میں گہرائی، بلاغت اور معنویت ہے، فن کے نئے امکانات پر ان کی نظر ہے مگر انھوں نے عالمی کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ انھیں خوبیوں سے یہ مجموعہ ہماری شاعری میں قابل قدر اضافہ ہے" (پروفیسر) آل احمد سرور

"وحید اختر اُردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو شاعری کی موروثی آبرو کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے نئی زندگی کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے مجموعے کو پہلے سے آخری صفحے تک تامل کے ساتھ پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وحید اختر "پتھروں کا مغنی" سے لے کر "صحرائے سکوت" تک یکساں طور پر کامیاب ہیں"

(پروفیسر) مجنوں گورکھپوری

کتابیں

ہماری سائنس — وزارت حسن ۲/۰۰

سائنس کے کرشمے — وزارت حسن ۲/۰۰

سائنس کی دنیا — " — ۲/۶۴

چند اور

بدن کی کہانی (معلومات) — اطہر پرویز ۱/۲۵

تیس مار خاں (بچوں کا ناول) — شاہد علی خاں ۰/۷۵

اکبر و بیربل کے لطیفے — ۱/۴۰

اُردو گھر ○ یونیورسٹی مارکٹ ○ علی گڑھ

سید احتشام حسین

ذکر اُس پری وش کا

جدید اُردو شاعری میں

اس "پری وش" کا ذکر کسی نہ کسی پہلو سے ہر زبان کی شاعری کا اہم ترین اور حسین ترین موضوع رہا ہے حالانکہ اس کے خط و خال، رفتار و گفتار، انداز و ادا، عبارت و اشارات اور ناز و غمزہ کے گوناگوں اور نت نئے روپ ہمیشہ سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ پری وش ہندوستان میں شکنتلا، یونان میں ہیلن، مصر میں کلوپیٹرا، عرب میں لیلیٰ، ایران میں شیریں اور پنجاب میں ہیر کا بھیس بدل کر متوجہ کرتی رہی ہے۔ اس کا انداز قد پہچاننے والے اُسے ہر جامے میں پہچانتے رہے ہیں اور اس کا بُت پوجنے والے ہر رنگ میں اس کی صنم گری کرتے رہے ہیں۔ کبھی تخیّل کی بے راہ روی نے اس کی صورت بگاڑ دی ہے اور کبھی وہ حقیقتاً جیسی ہے اُس سے حسین تر بنا کر پیش کیا ہے۔ تصوریت اور مثالیت کے باوجود سماجی ماحول نے اس کی انفرادیت متعین کرنے میں مدد دی ہے اور حالات نے اُس کے نقش و نگار میں اپنے عہد کا رنگ بھرا ہے۔ غرضکہ ہر دور میں اس کے لیے جان و دل نثار کرنے والے، اس کی جھلک دیکھنے، اس سے دو لفظ بول لینے اور اس کا قرب حاصل کر لینے کی تمنا میں جیتے اور مرتے رہے ہیں۔ تصورِ محض میں اُس کا نام حسن اور اس کے جذبۂ پرستش کا نام عشق رہا ہے لیکن شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کا مادّی وجود ہی جذبہ و فکر کی بنیاد بنا ہے۔ یہ پری وش

اُردو شاعری کا محبوب ہے جسے ہزاروں ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

بعض حقیقت پسند قدیم اُردو شاعری پر اکثر یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ اس کا محبوب یا تو ایرانی روایت کا کوئی اَمرد ہے یا کوئی طوائف اور بازاری عورت۔ روائتی غزل گوئی کے دائرے میں اس کا ایک پہلو کسی حد تک حقیقت پر مبنی کہا جا سکتا ہے لیکن تاریخی، سماجی، تہذیبی اور فنی روایات کی روشنی میں یہ ایک ادھوری حقیقت سے زیادہ نہیں۔ سچے، اصلیت پسند اور عظیم المرتبت شاعروں کے یہاں محبوب روایتوں میں اسیر نہیں ہے، اپنی شخصیت رکھتا ہے اور ہر شاعر کے ساتھ اس کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ہر سچے شاعر کی طرح ہر نیا عہد بھی محبت اور محبوب کے نئے تصور لاتا ہے اور وہ چیز جو بظاہر انفرادی اور داخلی نظر آتی ہے، کبھی سماجی اور تاریخی تقاضوں سے اور کبھی محض اظہار کی جدت اور نئے پن کی تلاش میں اپنی شکل بدل لیتی ہے۔

جب ہندوستانی سماج اور سیاست کا نقشہ بدلا تو محبوب وہ نہ رہا جسے جاگیردارانہ نظام کی پابندیوں نے جنم دیا تھا اور عاشق کو بھی زندگی کے جھمیلوں میں اس کی فرصت نہ رہی کہ وہ ؏

بیٹھا رہے تصورِ جاناں کئے ہوئے

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ محبت کا جذبہ ہی فنا ہو گیا لیکن یقیناً اس کا اظہار مسائلِ حیات اور غمِ روزگار کے نیچے دب گیا۔ حالیؔ جن کی غزلیں اس آگ سے سُلگ رہی تھیں، حالات سے اس قدر مبہوت ہوئے کہ اُنھوں نے محبت کی رام کہانی ہی چھوڑ دی اور قوم کا مرثیہ لکھنے لگے۔ محمد حسین آزادؔ نے اپنے مجموعۂ نظم کو حسن و عشق کی قید سے آزاد رکھا۔ تعمیری اور مقصدی شاعری کا ایسا زور بندھا کہ محبوب کا ذکر ہی غائب ہو گیا۔ جس طرح شیخ سعدیؔ نے دمشق کی قحط سالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ فاقوں کی وجہ سے لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے، شاید اسی طرح ۱۸۵۷ء کے انتشار

اور ہنگاموں کے بعد یہاں بھی عشق کی فرصت نایاب ہوگئی اور مضطرب دلوں سے آواز آئی ؏

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

نتیجہ یہ ہوا کہ جو شعراء محض روایتوں کے سہارے جی رہے تھے اُنھوں نے عشق کو رسمی تعشق اور محبت کو تعیش بنا لیا۔ عشق و محبت کے تذکرے میں غزل گویوں کے یہاں شدّت تو ضرور پیدا ہوئی اور مبالغہ آمیز انداز میں مرنے جینے کا ذکر بھی بہت آیا لیکن اس میں سچائی، گرمی، محبت کی تپش، عاشقانہ سپردگی نہ رہی۔ کچھ نئے غزل گویوں جیسے شادؔ عظیم آبادی اور حسرتؔ موہانی وغیرہ نے پھر توجہ کی اور محبت و محبوب کے خط و خال اُبھرنے لگے۔ یہ سلسلہ انفرادی مزاج کے لحاظ سے بعد کی غزل گوئی میں بھی جاری رہا جس کی نمایندگی فانیؔ، جگرؔ، فراقؔ نے کی بلکہ آخر الذکر نے تو عشقیہ اور جمالیاتی شاعری ہی کو اپنے افکار و خیالات کا مرکز قرار دیا۔

لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سال بھی عشقیہ شاعری کے لئے بہت ساز گار نہیں تھے کیونکہ کش مکشِ حیات میں زندگی نے دوسرے مطالبات پیش کر دئے۔ اس عہد کے نمودار شاعروں میں سرورؔ، چکبستؔ، نادرؔ کاکوروی، اکبرؔ اور اقبالؔ نے یا تو اپنی تاریخی روایات کی کھوج کی یا وطن دوستی کے جذبے پر تازیانے لگائے، یا تو بدلتے ہوئے سماج میں قومی شعور کو مہمیز کرنے کی کوشش کی یا اتحاد و اتفاق کا نعرہ بلند کیا۔ اس میں کبھی محبوب کی ذہنی صورت اور اس سے لگاؤ کا اظہار محض چند غزل گویوں کے افکار تک محدود رہا۔ اقبالؔ نے خودی، انسانی عظمت، جہد و عمل کا نعرہ بلند کیا اور اس سلمیٰ کو بھلا دیا جس کی گود میں بلّی کا بچہ دیکھ کر اُن کا دل دھڑکا تھا۔ سرورؔ اور چکبستؔ نے وطن کو محبوب بنا کر پیش کیا۔ اکبرؔ اور ظفر علی خاں نے شاعری کو سیاست کا لبادہ اُڑھا دیا لیکن اسی عہد میں جب قومی آزادی کی لہریں بلند ہو رہی تھیں، جب قدیم سماجی ڈھانچہ ٹوٹ رہا تھا، کچھ شعراء کے یہاں ایک قسم کا جذباتی اُبال اور اظہارِ شخصیت

کا جذبہ بیدار ہوا، جسے آسانی کے لئے رومانی تحریک کا عکس بھی کہا جا سکتا ہے۔ جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، ڈاکٹر بجنوری، عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی وغیرہ نے کسی قدر آزادانہ اُس عورت کا ذکر کیا جس میں محبوب بننے کی ساری ادائیں موجود تھیں۔ رومانی وفور کے تحت تقریباً ہر حسین عورت محبوبہ ہی بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ کہیں جنگل کی شہزادی ہے، کہیں جوگن، کہیں بھکارن ہے کہیں کنکر کوٹنے والی مزدور لڑکی۔ کہیں سلمیٰ ہے کہیں ریحانہ، کہیں بے پردہ سیر و تفریح کر کے دلوں کو لبھانے والی نوجوان حسینہ ہے، کہیں دیہات کی الھڑ لڑکی۔ اس دور میں محبوبہ تعیش کے طلبگار مرد، خیال پرست عاشق، سماجی بندھنوں سے محض ذہنی اور خیالی ٹکر لینے والے شاعر اور روایتی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین نوجوان کے خوابوں کی رانی ہے۔ یہ محبوبہ ابھی خود آزاد نہیں ہے، وہ محبت کا جواب محبت سے آزادانہ نہیں دے سکتی، بغاوت نہیں کر سکتی، اس کی اپنی آزاد شخصیت نہیں ہے۔ وہ صرف عاشق کی پرستش کا مرکز۔ محبت کی مجہول اور انفعالی شریک کار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کے یہاں محبوبہ کا حسن، اس کا لباس، بناؤ سنگار اور اس کی حیا پرستی اور انداز و اطوار کا نقش خالص ہندوستانی عورت کی تصویر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالی زیادہ ہے۔ اس عہد میں عورت کی بے چارگی اور مرد کے مقابلے میں اس کے کمتر اور کمزور سمجھے جانے کے خلاف ردّعمل بھی پیدا ہوا، یہ بھی رومانیت ہی کی ایک شکل ہے۔ مالن، جوگن، بھکارن سب اپنی خوب صورتی اور دل کشی کی وجہ سے متوجہ کرتی ہیں۔ ضمناً ان کی طبقاتی پستی اور زبوں حالی کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچے عشق کی وہ تصویر جو میرؔ، غالبؔ یا مومنؔ کی شاعری میں جادو جگاتی ہے، ان رومانی شعراء کے یہاں واضح طور پر موجود نہیں ہے۔ ان کے عشق کا کوئی مرکزی نقطہ نہیں ہے، ہر خوب صورت عورت کو محبوبہ سمجھ لینے سے عشق کا وہ

تصور ہی قائم نہیں ہوتا جس میں ذاتوں کے ایک دوسرے سے قریب آنے کی خواہش، ایک دوسرے کی آگ میں جل بجھنے کی تمنا، سپردگی کا لامتناہی احساس پیدا ہوا پھر بھی یہ وہ زمانہ ہے جب محبت کا ذکر آزادی، بیباکی اور قدرے سماجی احساس کے ساتھ شاعری میں آیا۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں جہاں ایک طرف اشتراکی افکار کے اثر سے سماجی زندگی میں اجتماعی انقلاب کی لے اُبھر رہی تھی وہیں فرائڈ کے جنسی نظریات کے تحت محبت کا تصور بھی نیا روپ دھارنے لگا تھا۔ افلاطونی یا بے غرض پاکیزہ محبت اگر کہیں ہو بھی تو وہ فنون لطیفہ میں کبھی جاندار انداز میں نہیں پیش ہوئی ہے ہاں جنسی محبت کے فطری تقاضے اور لطیف حقیقی پیکر قدیم اور جدید شعر و ادب مصوری اور صنم گری، رقص اور نقاشی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی پابندیاں اس جذبے کو دباتی رہی ہیں لیکن یہ علامتوں اور استعاروں کے پردے میں ہر جگہ عریاں ہوتا رہا ہے۔ فرائڈ نے اس کے لاشعوری اور نیم شعوری کھیل کا پتہ لگا کر ایک طرح سے شعور کو اس اظہار کے لئے آزاد کر دیا اور جنس کا ذکر اتنا ہی فطری نظر آنے لگا جتنا روٹی، کپڑے اور مسرت و یاس کا ذکر۔ چنانچہ وہ شعراء جنھوں نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے لکھنا شروع کیا اور جنھیں مغرب کی ادبی تحریکوں سے واقفیت بھی تھی، اُنھوں نے محبت کے جنسی پہلو کا اظہار کھلے بندوں شروع کر دیا، اس میں جنسی کج روی، جنسی گھٹن اور تھکن ہر ایک کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان شعراء نے اپنے جواز میں کبھی ہومر، سیفو، شیکسپیر، میر حسن، مومن، اجنتا اور ایلورا کو پیش کیا کبھی فرائڈ، ایڈلر اور لارنس کے نتائجِ افکار کو۔ اس سے جو تازگی اور جدت، جو فطری اظہار کی آسانی پیدا ہوئی وہ ضرور متوجہ کرنے والی تھی لیکن محبت اور محبوب کے تصورات میں ایسی زبردست تبدیلی رونما ہوئی کہ ان کا پہچاننا

مشکل ہو گیا۔ رومانیوں تک تو محبت میں انفرادی اور سماجی دونوں پہلو اپنے اپنے ڈھنگ سے آتے رہے لیکن اب ان شعراء کے یہاں محبوب کے نقش و نگار نگاہوں سے اوجھل ہونے لگے جو شعراء ہیئت کے تجربوں میں لگے ہوئے تھے اُنھوں نے محبوب اور محبت کو نظر انداز کر دیا اور جو خالص جنسی اُبال اور فطری میلان کی شکل میں دیکھتے تھے، اُنھوں نے اس کے سراپا سے آنکھیں پھیر لیں۔ کوئی شخص اس زمانے کے ن۔ م راشد، میرا جی، مختار صدیقی کا کلام دیکھے تو وہ اپنے ذہن میں محبوب کی کوئی ایسی تصویر نہیں بنا سکتا جس کے لئے دل و جان نذر کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ اس کے برعکس وہ شعراء جو سماجی احساس اور وقت کے تقاضوں سے سرشار تھے، سماج کو ایسا بنانے کے حق میں تھے جہاں محبت کی آزادی ہو۔ فیضؔ، مجازؔ، سردار جعفری، جوادؔ زیدی، مخدومؔ، کیفیؔ، تاباںؔ، جذبیؔ جنھوں نے ۱۹۴۷ء تک بہت کچھ لکھا، اس جذبے کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں کرتے رہے۔ فیضؔ نے محبوب سے پہلی سی محبت نہ مانگنے کی تمنا ظاہر کی کیونکہ وقت سازگار نہیں، لیکن ان کی شاعری میں محبوب کا آنچل، رخسار کی دمک، زلف کی چھاؤں اور آویزے کی ٹمٹماہٹ کا ذکر بھی اس سماجی ناانصافی کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہے جو محبت سے محروم کر دیتی ہے۔ یہی رنگ مجازؔ، سردارؔ، قاسمیؔ، کیفیؔ وغیرہ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ان شعراء کے یہاں محبوب محض تعیش کا سہارا نہیں، ساتھی بھی ہے جسے کارزارِ حیات میں ساتھ ساتھ چلنا ہے یعنی اسے خوابگاہ میں محبوب اور جہدِ حیات میں ساتھی بن کر رہنا ہے۔ انفرادی اور سماجی احساس کی یہ آمیزش مصنوعی نہیں تھی گو عشقیہ شاعری کے مخصوص نقطۂ نظر سے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی لیکن اس میں حقیقت پسندی کی ایک جھلک ضرور ہے۔ یہاں محبوب کم سے کم گوشت پوست کا وہ مجسمہ تو تھا جسے دیکھا، چھوا اور چاہا جا سکتا تھا!

آزادی کے بعد سے عشقیہ شاعری کا موقف بہت زیادہ بدل گیا ہے۔ نئے

شاعروں کو اب نہ کسی سیاسی، سماجی، تہذیبی نقطۂ نظر پر یقین ہے نہ محبت اور دوستی پر، نہ خوشی پائیدار ہے نہ غم سکون بخش ہے، کوئی تصور ذہن میں اس طرح نہیں جمتا کہ اُسے سینے سے لگاکر خوب صورت بناکر شاعری میں پیش کیا جائے۔ چند شعرا کو چھوڑ کر، کسی کا واسطہ اس محبوب سے نہیں رہ گیا ہے جو شاعری کا لازوال موضوع بنا ہے اور جس کے ذکر سے انسانوں کا دل دھڑکتا اور خوش گوار لذت حاصل کرتا رہا ہے۔
بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شاعری حُسن و محبت کی موت کا اعلان کر رہی ہے اور عشق کا جذبہ محض میکانکی اور کاروباری بن جانے والا ہے جس کا ذکر نفسیاتی اصطلاحوں میں جذباتی بے تعلقی سے کیا جائے گا۔

فراق گورکھپوری

بادۂ نغمۂ دل چھلکاؤ — بزمِ سخن میں چراغ جلاؤ
حسنِ زمینِ سخن چمکاؤ! — ساغرِ مہر و مہ چھلکاؤ
اے یارانِ طریقت آؤ — بے کاری میں ہاتھ بٹاؤ
عشق کی ہر وحشت کو سدھاؤ — ہر غم کو مانوس بناؤ
اے دشتِ ماضی کی ہواؤ — کچھ یادوں کے پھول کھلاؤ
اُس کی بھیجی ہوئی گھٹاؤ — میری خاک پہ کبھی منڈلاؤ
پردۂ شب سے ساز مِلاؤ — چنگ و رباب و دف کھنکاؤ
سوچو حیاتِ جہاں کیا ہے اور — آنکھوں میں آنسو بھر لاؤ
درد بھرے نغموں سے یارو! — کچھ دنیا کا درد بٹاؤ
دیکھو تم کو بھول نہ جاؤں — اب اتنا بھی یاد نہ آؤ
پاس ہے میرے کوئی اُسی سا — اس کو نکالو اُس کو چھپاؤ
رنگا رنگ نشاط سے یارو — غم کی اک تصویر بناؤ
دل سے بس اک آواز آتی ہے — آؤ! آؤ! آؤ! آؤ!
اچھا تم ہو؟ اتنے دنوں بعد — آؤ ادھر قریب آجاؤ
اک کامل نے کہا ہے کہ اُس کو — یاد بھی رکھو بھول بھی جاؤ
وقفۂ کسبِ دوام یہی ہے — عمرِ دو روزہ یوں نہ گنواؤ
روحِ نشاط کو رشک ہے مجھ پر — میری اُداسی پر مت جاؤ
میں تم کو رقصاں دیکھوں گا — مثلِ نسیمِ سحر بل کھاؤ

دل کو سوزِ نہاں میں یارو
اور تپاؤ اور تپاؤ

دل پر غم کی گھٹا چھائی ہے
تم بجلی بن کر لہراؤ

آئی نار دئی کی ماری
یارو دل کی خیر مناؤ

دور دور سے آنے والو
کوئی وہاں کا حال بتاؤ

کرے جو احسانوں کی تجارت
اُس محسن سے جان بچاؤ

ماتم خانۂ دل میں کسی کے
موجِ تبسّم بن کر آؤ

چھوڑ کے دولت و ثروت و طاقت
تم چاہو تو خدا ہو جاؤ

بادہ کشو سازِ مستی پر
ساقیِ محفل کے گُن گاؤ

وہ بھی اپنا ہو جائے گا
پہلے اپنے کو اپناؤ

اسی لواح سے مدفنِ عاشق
دُور ہی کتنا ہے ہو آؤ

دور جو تاریکی میں بجا ہے
دو کا گھنٹہ تھا، سو جاؤ

تم ہو، شام ہے، تاریکی ہے
کچھ باتوں کے چراغ جلاؤ

حاصل عشق یہی ہے یارو
کچھ پچھتاؤ، کچھ شرماؤ

وجد میں لاؤ بزم سخن کو
یارو غزل کے ساز اٹھاؤ

کتنی اُداس ہے شامِ غریباں
آج عشق کا سوگ مناؤ

محفلِ مے میں فراقؔ آتے ہیں
اہلِ بزم، کھڑے ہو جاؤ

روش صدیقی

کچھ اور ہی اب صورتِ حالات کہے ہے
جو ہم سے ملے ہے وہ تری بات کہے ہے

اے روشنی طبع نہ دُنیا کا گلا کر
کہنے دے اگر دن کو کوئی رات کہے ہے

ہم کفر کو ٹھہرائیں کہ ایماں کو سنبھالیں
وہ شوخ تو اک بات میں سو بات کہے ہے

اخلاص ہے نقاشِ خد و خالِ مشیت
گفتارِ خرد کشف و کرامات کہے ہے

کیوں شیخ حرم ہم کبھی نہ مل آئیں روش سے
دنیا اُسے دانائے خرابات کہے ہے

جاں نثار اختر

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اُس وعدہ شکن کو بھولیں

اب سوا اس کے مداوائے غم دل کیا ہے
اتنی پی جائیں کہ ہر رنج و محن کو بھولیں

آج تک چوٹ دبائے نہیں دبتی دِل کی
کس طرح اُس صنم سنگِ بدن کو بھولیں

اور تہذیبِ غم عشق نبھا دیں کچھ دن
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں



ہم کبھی آپ تھے یکتائے ہُنر کیا کہیئے
کھا گئی ہم کو زمانے کی نظر کیا کہیئے

روشنی ہو کہ نہ ہو رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
چاک ہے کب سے گریبانِ سحر کیا کہیئے

ہر متاعِ غم و آلام لُٹا بیٹھے ہیں
دردِ دل تیری امانت تھا مگر کیا کہیئے

شفاؔ گوالیاری

نگاہِ شوخ سے اپنی یہ پوچھو تو سہی پہلے
کہ تحریکِ محبت کس کی جانب سے ہوئی پہلے

کہیں پھولوں کے آنسو ہیں کہیں خاک آشیانوں کی
تباہی ایسی گلشن پہ نہ آئی تھی کبھی پہلے

خلوص دل نہ ہو جب تک فروغِ زندگی کیا ہو
کرے محسوس دردِ آدمی کو آدمی پہلے

پریشاں تم بھی ہو آشفتگیٔ رنگِ دوراں سے
تمہارے گیسوؤں میں کب تھی ایسی برہمی پہلے

نہ آدابِ بہاراں ہے نہ تعظیمِ محبت ہے
کھلا کرتی تھی اُن کا نام لے کر ہر کلی پہلے

نہیں ہے یہ ہمارے خونِ دل کا فیض تو کیا ہے
کہاں تھی آپ کی محفل میں اتنی روشنی پہلے

شفاؔ انسان کی فطرت بڑی حسّاس ہوتی ہے
کوئی غم ہونے والا ہو تو گھبراتا ہے جی پہلے

وقار خلیل

اُٹھاؤ سازِ وفا شغلِ جام و بادہ کرو
مسافرانِ سحر اہتمامِ جادہ کرو

دروغِ مصلحت آمیز کی یہ بستی ہے
ابھی زبان نہ کھولو نہ لب کشادہ کرو

سمٹ نہ جائے کہیں فاصلہ غمِ دل کا
شکستگی پہ بھی تم ظرف کچھ کشادہ کرو

یہ تیرگی، یہ اُداسی، یہ دشتِ تنہائی
چراغِ صبحِ تمنّا کی لو زیادہ کرو

جو ہو سکے تو کرو اہتمامِ بادہ و گل
حکایتِ لبِ جاں بخش کا اعادہ کرو

غزل کو یاروں نے پیشہ بنا لیا ہے وقارؔ
نہ فکرِ شعر میں اُلجھو نہ استفادہ کرو

مظفر حنفی

اب کیا جئیں کہ موت کے حیلے نہیں رہے
ناخن ہی وحشیوں کے نکیلے نہیں رہے
از خود مری کلاہ کا کج دور ہو گیا
ان بستیوں کے لوگ رنگیلے نہیں رہے
جو فرد جس جگہ بھی ہے ٹوٹا ہوا سا ہے
تہذیب آئی ہے تو قبیلے نہیں رہے
اب خود کلامیاں ہی مری کائنات ہے
یاروں سے گفتگو کے وسیلے نہیں رہے
یہ کیا کہ آسمان کا سایہ بھی اٹھ گیا
حدِ نظر کے رنگ بھی نیلے نہیں رہے

○

دریا گم دَل دَل باقی ہے
رسّی جل گئی بَل باقی ہے
پتھر تو پوجا جائے گا
جب تک شیش محل باقی ہے
چکھتے چکھتے عمر گذاری
صبر کا میٹھا پھل باقی ہے
پنڈت جی ! لے آؤ لوٹل
تھوڑا گنگا جَل باقی ہے
میرا دامن کورا نکلا
اب تیرا آنچل باقی ہے
بھور ہو گئی چلتے چلتے
یادوں کا جنگل باقی ہے
بس مقطع ہو جائے مظفر
کٹ گئی رات غزل باقی ہے

فضیل جعفری

چھو بھی تو نہیں سکتے ہم موجِ صبا بن کر
للچائی نگاہوں سے تکتے ہیں گلابوں کو

سو دکھ ہمیں دیتی ہے ہاں تشنہ لبی لیکن
پانی تو نہیں سمجھے ہم لوگ سرابوں کو

انسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا
دل اور بھی الجھے گا پڑھئے نہ کتابوں کو

سچ ہے دلِ دیوانہ خوابوں سے بہلتا ہے
ہر رات مگر کیسے بہلائیے خوابوں کو

حمدون عثمانی

در در پھرے ہیں آپ لئے چشمِ تر جناب
بتلائیے کسی پہ ہوا کچھ اثر جناب

اپنے میں جھانکئے جو کسی کی ہے جستجو
باہر کسے ملا ہے کوئی چارہ گر جناب

اب موندئیے بھی آنکھ کہ نظارہ کر چکے
کب کامیابِ زیست ہوئے دیدہ ور جناب

اک سعی رائگاں ہے شعاعوں کو تھامنا
تاریکیاں ہیں ان سے کجا معتبر جناب

اب آئیے بھی شام ہوئی مے کدہ چلیں
کیا کیجئے گا رکھ کے کسی کی خبر جناب

اٹھئے عمارِ خانۂ ہوش و حواس سے
کیا ہو رہے ہے کیجئے خود پہ نظر جناب

اقبال ماہر

پرتوِ روئے یار سے چہرۂ آفتاب فق
شاخِ نجوم سرنگوں لالہ و گُل عرق عرق

تیری تلاش میں کبھی اُلٹے جو کھول کے ورق
ذکر ترا سطر سطر نام ترا سبق سبق

عشق کی نامرادیاں خشک ہیں دل کی وادیاں
کشتِ امید بے گیاہ دشتِ حیات لق و دق

غم کی حکایتیں غلط، ان کی شکایتیں فضول
حسن سے نہ وعدۂ نباہ حسن پہ نہ کوئی اپنا حق

عرضِ نیاز دل پہ تھا دونوں طرف عجیب حال
عشق کو تھیں ندامتیں حسن بھی تھا عرق عرق

درد کی ایک لہر سے روئے زمیں پہ زلزلہ
عشق کی ایک آہ سے سینۂ کائنات شق

ماہ و نجوم سیرگاہ عرش پہ بھی مری نگاہ
میرا زمیں سے واسطہ کون و مکاں پہ میرا حق

علم تھا بے اثر مگر عشق کی ایک ضرب سے
کھل گئے فکر و ذہن پر آج چہاردہ طبق

عقل ہے گُم نجوم چپ درسِ گہِ علوم بند
شرحِ وفا بڑی کٹھن دل کی زباں بہت ادق

پرسشِ غم کا شکریہ چشمِ کرم کا شکریہ
آج رُخِ حیات پہ آتو گئی ذرا رمق

بطنِ صدف سے ماہ تک سلسلۂ جمالِ یار
حدِ نظر سے بھی وسیع خواب و خیال کا اُفق

بادِ صبا کا بانکپن قوسِ قزح کا پیرہن
رُخ پہ تجلیِ سحر، لب پہ تبسمِ شفق

چشمِ غزل طراز نے اُن کو ادب بنا دیا
میری کتابِ شوق کے بکھرے ہوئے تھے جو ورق

رازِ طلسمِ ہست و بود کیا ہے معمۂ وجود
دفترِ آگہی خموش، چہرۂ فلسفی ہے فق

ماہر درد آشنا جھیل گیا غمِ حیات
تم نے مگر جو دُکھ دیا، دل کو بہت ہوا قلق

پرکاش پنڈت

دلّی ہے ایک شہر

جب میں نے دلّی کا رُخ کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ کوئی شوقیہ یا اتفاقیہ بات نہ تھی اور اب یہ بھی کوئی شوقیہ یا اتفاقیہ بات نہیں ہے کہ پچھلے دس برس سے کہ جب سے میں دلّی میں آباد ہوں، ہمارا میاں بیوی کا رشتہ بہن بھائی کے رشتے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

آگے چل کر میں میاں بیوی اور بہن بھائی کے رشتے کا فرق بتاؤں گا۔ آگے چلنے سے پہلے ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے اس قسم کی توقع بے کار ہے۔ یہ فرق جاننے کے لئے آپ منو مہاراج کی منوسمرتی کا مطالعہ کیجئے جس کا ترجمہ لاطینی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ تمام مہذب زبانوں میں موجود ہے۔ دھرم کرم کی باتوں سے ہٹ کر میں یہاں صرف دلّی میں اپنے دس برس کے قیام کا ذکر کروں گا۔

ان دس برسوں سے پہلے کے پانچ برسوں میں یعنی آزادی ملنے کے بعد کے پانچ برسوں میں مَیں نے لُدھیانہ، ڈیرہ بابا نانک، الٰہ آباد، سیتا پور اور بمبئی میں اپنے آپ کو کھپانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ڈیرہ بابا نانک اور سیتا پور میں مکان ملا لیکن کام نہ ملا۔ لُدھیانہ اور الٰہ آباد میں کام ملا لیکن مکان نہ ملا اور بمبئی میں نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم جو چند ٹکے ہاتھ میں تھے وہ بھی نکل گئے لہٰذا دلّی کا رُخ کرنے کا فیصلہ کیا کہ جس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔

یہ وہ دن تھے جب ہندو مسلم فسادات کے بعد ہندو مسلم کھینچا تانی جنم لے رہی تھی غیر سرکاری

اور بھر پور سرکاری والنٹیر آزادی کا زیادہ سے فائدہ اُٹھا رہے تھے مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر پاکستان بھجوایا جا رہا تھا۔ اُن کے گھروں کا سامان اَونے پَونے خریدا یا لُوٹا جا رہا تھا اور اُن کے مکانوں کی پگڑیاں وصول کی جا رہی تھیں۔ پہلے دو دن ایک سرائے میں کٹ گئے قسمت میں پانڈوؤں مغل شہنشاہوں، انگریز وائسرائوں، کانگریسی نیتاؤں اور اشتہاری حکیموں کے دارالخلافہ کی رونق بڑھانا لکھا تھا کہ تیسرے دن جب مانند سندباد جہازی کے میری نظریں آسمان پر تھیں اور میں گاندھی گراؤنڈ میں کھڑا آسمان میں اُڑانیں بھرتے ہوئے اور امن وآشتی کے اشتہاروں کی بوندا باندی کرتے ہوئے طیاروں کا نظارہ کر رہا تھا اور تعریف اُس خدا کی کر رہا تھا جس نے جہاں بنایا، ایسی زمیں بنائی یہ آسماں بنایا کہ اچانک فرشتہ صورت فرشتہ سیرت ایک رشتہ دار سے مُٹھ بھیڑ ہو گئی۔ ہنس ہنس کر قصۂ غم بیان کیا، وہ رو رو کر اور لپٹ لپٹ کر خدا کا شکر بجالائے کہ اب سب پانسے سیدھے پڑیں گے اور مجھے اور میرے بیوی بچّوں کو اپنے یہاں اُٹھالے گئے۔

جس محلّے میں وہ رہتے تھے اس کا نام نیا محلّہ تھا لیکن دراصل وہ کوئی نیا محلّہ نہ تھا۔ بلکہ بہت عرصہ پہلے اُسے مسلمان بھٹیاروں اور کنجڑوں نے آباد کیا تھا۔ بھٹیاروں اور کنجڑوں کے آباد ہونے سے پہلے وہاں ایک وسیع وعریض باغ تھا جس میں ارنڈ یعنی مرنولی کے بے شمار درخت تھے اور وہ ارنڈی کا باغ کہلاتا تھا۔ ارنڈی کے باغ نے نئے محلّے کی شکل اختیار کرتے کرتے کتنے چولے تبدیل کئے، اس کے صحیح اعداد وشمار تو مجھے معلوم نہیں ہو سکے، البتہ حکیم معصوم علی دہلوی نے جو اس محلّے کا سب سے قدیم باشندہ سمجھا جاتا تھا اور جو حکمت کے ساتھ ساتھ بانجھ اور ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو گنڈے اور تعویذ دیتا تھا اور بچّوں کو قرآن مجید کی آیتیں رٹاتا تھا، لیکن اب جس نے قرآن مجید کو لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا تھا اور محلّے کے نئے باسیوں کو آوازیں دے دے کر اُن کی آنکھوں میں نورانی سرمے کی سلائیاں پھیرتا تھا اور اپنی مہندی رنگی داڑھی اور لب ترشی مونچھوں

میں مسلسل مسکراتا تھا، مجھے بتایا کہ لفظ ارنڈی کا الف مقصورہ کثرتِ استعمال سے ٹوٹتے ٹوٹتے ہمیشہ کے لئے گر گیا اور ارنڈی کا باغ پہلے رنڈی کے باغ میں اور پھر رنڈی کے محلے میں تبدیل ہو گیا۔

رنڈی کے محلے کو پنجابی برادری کے مسلمانوں نے نئے محلے کا نام دیا۔ کیونکہ کنجڑوں اور بھٹیاروں نے مغل زمانے کے ہندو جاگیرداروں کی بغل میں رنڈی کا محلہ آباد کر کے ایک فاش غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ ہندو جاگیرداروں کو بھلا بھٹیاروں اور کنجڑوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ بلیماران اور پھاٹک حبش خاں کے مسلمان نوابوں کی طرح بٹیر باز، مرغ باز، کنکوے باز اور رنڈی باز تھے اور ایک ایسا محلہ جو لفظ رنڈی کی توہین کرتا ہو اور جس میں چھم چھماتی رنڈیوں کے بجائے دن بھر بھاڑ جھونکنے اور گلا پھاڑ کر ٹکے سیر ٹکے سیر چلانے والے بھٹیارے اور کنجڑے آباد ہوں، انھیں بھلا رنڈی کے نام پر مرمٹنے والے جاگیردار کیسے برداشت کرتے۔

انھوں نے بھٹیاروں اور کنجڑوں کو برداشت نہ کیا لیکن انھیں پنجابی برادری کے مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔ پنجابی برادری کے تاجر بچے ان کی ٹکّر کے تھے۔ انھوں نے بڑی عالیشان عمارتیں کھڑی کیں اور کہتے ہیں کہ بعد ازاں ان تاجر بچوں نے دیوالیہ جاگیرداروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جس کی تاب نہ لا کر بھٹیارے اور کنجڑے جاگیرداروں کی آل اولاد کو دعائیں دیتے ہوئے کہیں اور اُٹھ گئے تھے۔

لیکن آزادی کے بعد اب کچھ ایک مسلمان گھرانوں کو چھوڑ کر، جن کی حالت معصوم علی دہلوی کی طرح اسم بامسمّٰی تھی محلے بھر میں مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ سے آئے ہوئے ہندو، سکھ شرنارتھی آباد تھے اور مجھے تعجب ہوا کہ ابھی تک انھیں اس محلے کا نام بدلنے کا خیال کیوں نہیں آیا تھا ــــ محلہ سردار برچھا سنگھ، محلہ لالہ دودھاری مل، کالی کلکتے والی کا محلہ ــــ دسیوں نام تھے جو رکھے جا سکتے تھے اور جو دسیوں شہروں میں

رکھے بھی جا چکے ہیں۔

"ہندو تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے"۔ شری یت مُرلی منوہر، جو اس محلّے کے رکشا دل کے منتری مقرر ہوئے تھے، آدھی رات کے وقت کمال بے تکلفی سے ایک مسلمان کے گھر کا سامان اُٹھا اُٹھا کر گلی میں پھینک رہے تھے۔

"ہندو تمہارا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے"۔

"ہندو ہرگز ایسا نہیں کریں گے"۔ شور و اویلا سُن کر میں اپنے رشتہ دار کے محل نما مکان سے نکل کر وہاں پہنچا۔

"مارے جوتوں کے ہندو تمہارا بخیہ اُدھیڑ ڈالیں گے"۔ اُنھوں نے میرے دھاری دار تہبند سے میرے مسلمان ہونے کا اندازہ لگایا۔

"ہندو ہرگز ایسا نہیں کریں گے"۔ میں نے گلی میں کھڑے دس ایک مسکین صورت مسلمانوں کی طرف دیکھ کر دہرایا جس میں سے نہ جانے کس بدبخت کے مُنھ سے نکل گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں!

"تم کون ہو جی؟" شری یت مُرلی منوہر نے آپے سے باہر ہو کر ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے لکڑی کے پنگوڑے کو زمین پر پٹک دیا اور مُجھے گلے سے آدبوچا۔

"میں ہندو ہوں"۔

"تم ہندو نہیں ہو"۔

"میں اُلّو کا پٹھا ہوں"۔

"تم ہندو نہیں ہو"۔

"میں گدھے کا بچہ ہوں"۔

انھوں نے جلال میں آ کر میرے پیٹ میں گھونسا مارا، مُنھ پر تھپڑ اور میرا گریبان چاک کر دیا۔ اور مجھے گھسیٹتے ہوئے مقامی تھانے میں لے گئے اور وہاں یہ بیان دے کر

اور دو گواہیاں دلوا کر کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف بھڑکاتا ہوں، دنگا کرتا ہوں اور پاکستان خفیہ خبریں پہنچاتا ہوں، اُنھوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔

ہند دکھانے دار نے کہ ہندوستان کا بہت ہی خیر خواہ معلوم ہوتا تھا مجھے ماں کی گالی دی۔ سپاہی کو حکم دے کر میرے چوتڑوں پہ بید لگوائے اور رات بھر کبھی مُرغ بننے اور کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا رہنے کی سزا دی۔ یہ سزا دوسرے دن کے لئے بھی تھی۔ شاید تیسرے اور چوتھے دن کے لئے بھی۔ لیکن صبح جو آنکھ تھانے دار صاحب کی کھُلی تو عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی۔ یعنی شری یت مُرلی منوہر نے تھانے میں آ کر پہلے تھانیدار صاحب سے اور پھر مجھ سے معافی مانگی اور مجھے مسلمان سمجھنے اور اس وجہ سے میری ہڈّی پسلی ایک کر دینے پر افسوس کا اظہار کیا اور مجھے بخیر و عافیت رہا کروا دیا۔

اب جو واپس محلّے میں پہنچا تو ایک عجیب ہی منظر نظر نواز ہوا۔ رشتے دار بہادر کہ فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت تھے، تیسری شہانی صبح ہی چنڈال صورت نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا والمیکی رامائن کے میگھ ناد کو کسی نے کچّی نیند سے جگا دیا تھا اور اُس کی گرجنا، بادل کی کڑک اور بجلی کی تڑپ سے بازی لگا رہی تھی —— اور میری بیوی کہ محل میں قدم رکھتے ہی کنگھی، چوٹی اور بچّوں کو نہلانے دھُلانے اور چومنے چاٹنے میں مصروف ہو گئی تھی، پریشان زلف، بندھے ہوئے بستر پہ بیٹھی بچّوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہی تھی اور بچّے پاس پڑے ہوئے ٹرنکوں کے علی گڑھی تالوں سے مندروں کی گھنٹیوں کا کام لے رہے تھے۔

اس کوچے کا نام کوچہ قابل عطار تھا اور اگرچہ پورے کوچے میں کسی بچّے بوڑھے یا جوان کی شکل عطار نامی مخلوق سے نہیں ملتی تھی اور عرق سونف یا عرق گاؤزبان کی خوشبو سونگھنے کے لئے لال کنواں سے درے کوئی جگہ نہ تھی پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر چیز کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی بدعت ترک کر دوں گا۔ پھر میری بیوی

نے بھی کہ ویدوں کے زمانے کی یادگار ہے، ویدوں کی سنہری روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ آخر ہتی کے کرموں کا پھل تینی کیوں بھگتے؟ اپرادھ کرے پتا اور دنڈ ملے سنتان کو! کان لپیٹ کر نئے محلّے میں پڑے رہتے تو کیا بگڑ جاتا، یوں گھر گھر تو ذلیل نہ ہوتے۔

لفظ گھر پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے میاں کی وفا شعار بیوی! یہ گھر تیرا ہے نہ میرا ہے، چڑیا رین بسیرا ہے۔۔۔ یعنی پہلے یہ گھر مسلمانوں کے تھے اور اب کسٹوڈین بہادر کے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ نئے محلّے والے محل پر میرے چچازاد بھائی نے بزورِ بازو قبضہ کر لیا اور بھگوان نے اُسے رشوت دینے کی توفیق دے رکھی ہے اور کوچہ قابل عطار کا یہ نانک شاہی کھنڈر تمھاری ممیری بہن کے شوہر کے حصّے میں آیا۔ کسٹوڈین بہادر کی دہلیز پر ہر ایرے غیرے کی نہیں صرف نتھو خیرے کی رسائی ہے۔

وہ سمجھی میں اس کے مائیکے گھر کی توہین کر رہا ہوں۔

میں سمجھا وہ براہِ راست میری توہین کر رہی ہے۔

دراصل ہم دونوں نے غلط سمجھا اور اسی بے سمجھی میں اُس نے کچھ آنسو بہالئے۔ میں نے کچھ آہیں بھر لیں اور بچے تھوڑا رو گا لئے۔ غرض ہم سب کی تھوڑی تھوڑی ورزش ہو گئی اور جسم ہلکے ہو گئے اور طے پایا کہ جب تک کوئی ملازمت نہیں مل جاتی اور پگڑی کے لئے روپے جمع نہیں ہو جاتے ہم سب کان لپیٹے پڑے رہیں گے۔ البتہ بچوّں پر اس شرط کا اطلاق اتنی سختی سے نہیں ہو گا۔ وہ چاہیں تو کبھی کبھی کان کتر سکتے ہیں اور بوقتِ ضرورت کھا بھی سکتے ہیں۔

مسلسل ایک برس تک جوتیاں چٹخانے اور اس عمل سے دونوں جوتوں کے تلوں میں یہ بڑے بڑے سوراخ ہو جانے اور ان میں صبح و شام بڑی باقاعدگی سے کاغذ اور گتّے کی دھجیاں بھرنے پر بھی کوئی ملازمت نہ ملی۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ کے حصول کے لئے لازم تھا کہ میں کسی بڑے آدمی کا داماد یا کم از کم سالا ضرور ہوتا اور چونکہ خاکسار میں شروع سے ہی

اس قسم کے اوصاف کا فقدان رہا ہے اس لئے ملازمت کے بجائے ایک بار پھر مجھے حوالات ہی کے اہل سمجھا گیا۔

میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ حوالاتوں یا جیلوں میں چکیاں پیسنا، جھڑکیاں، گھرکیاں، گالیاں اور تھپّڑ کھانا اور مچھّروں، کھٹملوں اور حوالداروں سے اپنا خون چُسوانا میری اہلیت کا تقاضا نہیں ہے۔ میری اہلیت کے کچھ اور ہی تقاضے ہیں اور اپنے تجربے کی بنا پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان بھر کی جیلوں اور حوالاتوں کے نوّے فی صدی قیدیوں کی اہلیت کے بھی کچھ (اور ہی) تقاضے ہیں۔

لیکن میرے اس قول سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ دلّی میں جسے مکان اور ملازمت کے اہل نہیں سمجھا جاتا، اُسے جیل یا حوالات کے اہل سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف ذاتی تجربے کی بات ہے اور دلّی ایسے تاریخی دارالخلافے میں ظاہر ہے، ذاتی تجربوں کو لادنا قطعی نامناسب بلکہ اپنی ہٹ دھرمی کا ثبوت دینا ہے۔

خیر، بات میرے دوبارہ حوالات میں پہنچنے کی تھی۔ ہمارا وہ نانک شاہی کھنڈر کہ جس کی کوئی چھت یا دیوار سلامت نہ تھی اور جس کے صحن کے ایک کونے میں ٹاٹ کے ٹکڑوں کو جوڑ گانٹھ کر تان لیا گیا تھا، ہم سولہ افراد کے لئے کسی طرح بھی کافی نہیں تھا۔ لیکن میں، میری بیوی، ہمارے تینوں بچے، ہمارے تینوں بچوّں کی خالہ، خالو اور خالہ اور خالو کے پون درجن بچے جیسے تیسے ایک دوسرے پر ڈھیر ہو کر وقت کاٹ رہے تھے۔ لیکن پھر جب برسات شروع ہو گئی اور چاروں طرف سے کھُلی ہونے کی وجہ سے ہماری جائے رہائش مانند ایک تالاب کے ہو گئی۔ اور چونکہ تیرنا ہمارے کنبے میں سے کسی کو نہیں آتا تھا اس لئے میں نے اور میری لنف بہتر نے طے کیا کہ کم از کم اپنے بچوّں کو لے کر ہم رات کے وقت میونسپل کمیٹی کے کسی برآمدے میں جا سویا کریں گے میرے بچوّں کی خالہ اور خالو اور اُن کے بچوّں کو چونکہ ہر وقت اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا کہ کوئی ان کے مکان، پر جبراً قبضہ نہ کر لے اس لئے ان میں سے کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا

اور پوری برسات اس شاہی اصطبل کی حفاظت میں کاٹ دی۔

یوں تو میونسپل کمیٹی کے برآمدوں میں کبوتروں کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کو سونے کی اجازت نہیں تھی لیکن دو ایک دن دھتکارے جانے کے بعد ہم پر یہ راز منکشف ہو گیا کہ کبوتروں کے ساتھ ساتھ ہم بھی وہاں سو سکتے ہیں بشرطیکہ چوکیدار کی خدمت میں فی کس ایک آنہ یومیہ بطور نیند ٹیکس پیش کریں۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور ہم خوب ٹھاٹھ کے ساتھ گھوڑے بیچ کر سوئے (چونکئے نہیں، محاورے کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ عربی گھوڑے ضرور ہی پاس ہوں) لیکن پانچ آنے یومیہ کا خرچ چونکہ کافی بڑا خرچ تھا اور آمدنی پانچ ٹکے کی بھی نہیں تھی اور اہلیہ محترمہ کے کان میں صرف ایک بُندا رہ گیا تھا اس لئے مجبوراً ایک دن چوکیدار صاحب سے جھگڑا ہو گیا اور جھگڑے کا نتیجہ آپ جانتے ہیں ہمیشہ اس شخص کے حق میں نقصان دِہ ہوتا ہے جو کسی میونسپل کمیٹی میں چوکیدار تک نہ ہو۔ لہٰذا چوکیدار صاحب نے ایک پولیس کانسٹبل کو بلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا کہ میں بے حد خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہوں۔ ہر رات بند دروازوں کے شیشوں میں سے اندر جھانکتا ہوں اور میرا ارادہ کانفیڈینشل فائلیں چُرانے کا ہے۔

کانسٹبل صاحب نے مجھے پرے لے جا کر پہلے بہت دھمکایا اور پانچ روپے کا اور پھر میرے بیوی بچوں کا خیال کر کے صرف دو روپے کا مطالبہ کیا۔

میں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ حضرت اگر میرے پاس دو روپے ہوتے تو میں اور میری بیوی اور میرے تینوں بچے کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں آرام سے نیند کے مزے لے سکتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ کانسٹبل صاحب کو میرے بیوی بچوں کے بجائے اپنے بیوی بچوں کا زیادہ خیال تھا لہٰذا دو روپوں میں سے وہ ایک دم اٹھنی پر اتر آئے لیکن جب میں نے اپنی دونوں جیبیں جھاڑ کے انھیں دکھا دیں تو وہ مجھے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح اس بار کوتوالی میں میرا تعارف بطور آوارہ گرد ہوا۔

دو بار کی حوالات سے میرے حوصلے کافی بڑھ گئے تھے۔ اور حالانکہ جان جسم مارے فاقوں کے ایک ہو گئے تھے لیکن میں خوب اکڑ کے اور چھاتی پھلا کے چلتا تھا اور کسی شریف یا بدمعاش کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ملازمت ملنے کا چونکہ اب کوئی امکان نہ رہا تھا اور دہی بڑوں یا ریوڑیوں کی ریڑھی کا لائسنس بغیر رشوت دیے نہ مل سکتا تھا اور حالت یہ تھی کہ پیٹ تک کو رشوت دینے کی توفیق نہیں تھی، اس لئے میں نے بیوی بچوں سے کنارا کر لینے کی ٹھانی۔ اس نیک بخت سے کہا کہ کچھ دنوں کے لئے اپنے مائیکے جھنڈیالہ گورو ضلع گورداسپور میں چلی جائے۔ یہاں اُس کے باپ کو کچھ زمین الاٹ ہو گئی تھی اور بیلوں کی جوڑی اگرچہ پاس نہیں تھی پھر بھی وہ خود اور اس کا جوان بیٹا ہل کے آگے جت جتا کر پیٹ بھرنے کو گھاس پھونس اُگا لیتے تھے اور میں نے بلا ٹکٹ سفر کرنے کے لاتعداد فائدے گنوا کر اُسے بچوں سمیت گاڑی میں بٹھا دیا اور مجھے آج تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ نیک بخت اور وہ فرمانبردار اولاد بخیریت اپنی منزل مقصود تک پہنچ چکی ہے یا میری طرح کسی جیل خانے کی ہوا کھا رہی ہے؟

جی ہاں، آج کل میں جیل خانے کی صاف و شفاف اور آکسیجن سے لدی ہوئی ہوا کھا رہا ہوں اور ابھی میرا ارادہ پورے چھ مہینے تک یہی ہوا کھانے کا ہے کہ فاضل جج نے میرے پھیپھڑوں کے معائنے کے بعد یہی نسخہ تجویز کیا تھا۔

مسلسل فاقوں اور دلی کی تنگ و تاریک گلیوں اور حلوائیوں کی گھُٹی ہوئی بھٹیوں کی کاربن ڈائی آکسائیڈ کھا کھا کر میرے پھیپھڑے کافی مضبوط ہو گئے تھے لیکن اُن کی مضبوطی کم کرنے کے لئے کمپنی باغ یا کسی دوسری کھُلی جگہ میں سونے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور پھر انہیں دنوں نارووال کے نامی پہلوان کے ایک شاگرد۔۔ ہیٹھے جمنا داس عرف جُمّا پہلوان سے میری دوستی ہو گئی۔

میری اس کی دوستی کسی جسمانی یا روحانی ہم آہنگی کا نتیجہ نہ تھی۔ وہ نارووال میں ہر اتوار کے دن اکھاڑے میں اُتر کر علاقے بھر کے پہلوانوں کو للکارا کرتا تھا اور گلے میں گیندے کے ہار پہن کر

محلے لوٹے کے ہر گھر سے نقدی، دودھ اور بادام وصول کیا کرتا تھا اور اپنی آہنی چھاتی پر مکے مارتا تھا۔ اور مجھے شروع سے ہی ایسے پہلوانوں سے سخت نفرت رہی ہے جو ہر وقت لنگر لنگوٹ کسے ننگ دھڑنگ ہو کر یہاں وہاں خم ٹھونکتے پھرتے ہیں۔

میری اور اس کی دوستی صرف اور صرف اس کے گول گپّوں کی چٹ پٹی کانجی کی وجہ سے ہوئی۔ آزاد ہندوستان میں آنے کے بعد اُس نے پہلوانی چھوڑ دی تھی اور اب سونٹھ پانی کے بتاشوں یعنی گول گپّوں کا خوانچہ لگاتا تھا۔ قاضی حوض کے چوراہے میں وہ ہانک لگا لگا کر ہر راہگیر کو کانجی چکھنے کی دعوت دیتا تھا اور فاقوں کے اس زمانے میں مَیں نے دن میں بیس بیس بار کانجی چکھی، ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد میں بالکل بے تعلقی سی دکھاتا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اور کچھ یہ ظاہر کرتا ہوا کہ کسی انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں لپک جھپک چلا جا رہا ہوں، اس کی ہانک پر چلتے چلتے ٹھٹھک جاتا۔ کانجی کا ایک کسورا پیتا اور پھر منہ بگاڑ کر اسی تیزی کے ساتھ آگے نکل جاتا۔ لیکن چونکہ کبھی ایک بار بھی میں نے اس کے گول گپّے نہیں کھائے تھے اس لئے ایک دن پکڑا گیا اور جس دن پکڑا گیا، اسی دن سے میری اس کی دوستی ہو گئی۔

میری طرح دلّی میں وہ بھی بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھا۔ پہلوان ہونے کے ناتے اپنی صحت کی حفاظت کے لئے اس نے شادی نہ کی تھی اور اب اگرچہ رسّی جل گئی تھی یعنی خونی بواسیر کے عارضے سے وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا اور اسے درد گردہ کی بھی شکایت رہنے لگی تھی لیکن بَل ابھی تک نہیں گیا تھا۔ اور یہ بَل اور بھی پُرپیچ ہو جاتا تھا جب کوئی سنتری اُدھر آنکلتا اور اُسے اپنا خوانچہ اُٹھا کر پاس کی گلی میں سرپٹ بھاگنا پڑتا۔

دن میں دسیوں بار ایسی نوبت آتی اور دسیوں بار پیرتانی آنکھوں اور ٹوٹے ہوئے کانوں سمیت اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو جاتا۔ انجر پنجر جسم کی تمام رگیں تن جاتیں اور وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اور منہ بھر بھر کر پولیس کو ماں بہن کی گالیاں دیتا۔

اور ایک دن پولیس کو ماں بہن کی گالیاں دینے میں مَیں نے بھی اسی کا ساتھ دیا۔

کیونکہ اس دن سیکڑوں دوسرے خوانچوں اور چھیبوں کے ساتھ پولیس اس کا خوانچہ بھی لاد لے گئی تھی اور میری طرح اب وہ بھی بالکل لنڈورا ہو گیا تھا۔ اور اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ دوبارہ خوانچہ لگا سکتا۔ اپنی بواسیر اور درد گردہ کا علاج کروا سکتا اور میرا پوتھ بھی پورا کرتا۔ لیکن چونکہ دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ اس آڑے وقت میں مَیں اس کا ساتھ نہ چھوڑوں، لہذا میں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور تیسرے دن جب اُس نے اپنے تہبند کے دونوں پلّو جھاڑ کر دکھا دیئے تو ہم دونوں نے ایک ساتھ دو دن تک کڑا فاقہ کیا ــــ میں تو خیر فاقوں کا بہت پہلے سے عادی تھا۔ نہ میرے خون جاتا تھا اور نہ ہی مجھے درد گردہ ایسی خطرناک بیماری تھی، اس لئے میں تو ہنستے گاتے جھیل گیا لیکن جُما کی حالت غیر ہو گئی اور چوتھے دن تو اس میں ہلنے تک کی سکت نہ رہی اور نہ صبح سے شام تک نئی دلّی کے اندر دپارک میں پسلیوں میں ہاتھ دیئے پڑا رہا اور کراہتا رہا اور میں اس کے سامنے کو بھگو بھگو کر اس کے منھ میں پانی ٹپکاتا رہا۔ پھر شام گہری ہو گئی ــــ کناٹ پیلس کی دوکانوں کی بتیاں جل گئیں، پارک کے ہنڈے بھی جل گئے۔ اور نئی دلّی نئی نویلی دلہن کی طرح سج گئی لیکن وہ برابر کراہتا رہا۔ پارک میں ننھے ننھے خوب صورت بچے کھیلتے رہے اور ریشم سے لدی ہوئی حسین لڑکیاں اور ان کی بھدّی مائیں یہاں وہاں اٹھلاتی رہیں لیکن وہ کراہتا رہا۔ اور اسی طرح پسلیوں میں ہاتھ دیئے اور کراہتے کراہتے اس نے کراہنا بند کر دیا۔

پھر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ حسین لڑکیوں اور اُن کی بھدّی ماؤں نے ناک پر رومال رکھ لیئے اور اپنی شام کے تباہ ہو جانے کا ماتم کرتی ہوئی وہاں سے کھسک گئیں اور کسی نے پولیس چوکی پر ٹیلیفون کر دیا۔

ایک انسپکٹر صاحب آئے۔ دو حوالدار اور ایک درجن سپاہی آئے۔ میونسپل کمیٹی کی مُردہ گاڑی آئی۔ انسپکٹر صاحب کے حکم پر مُردے کے دونوں ہاتھوں اور

دونوں پیروں کے چھپّے لے گئے۔ اور پھر انسپکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس کا نام دھام اور پتہ ٹھکانا بتاؤ۔

میں نے نام دھام اور پتہ ٹھکانا بتانے سے انکار کر دیا۔

اُنھوں نے مجھے ڈانٹا۔ میں نے اُنھیں ڈانٹا۔ اُنھوں نے مجھ سے کچھ سوال کئے، میں نے بھی اُن سے کچھ سوال کر ڈالے۔

لیکن جواب چونکہ دونوں میں سے کسی نے نہیں دیا تھا اس لئے میونسپل کمیٹی کی گاڑی مُردے کو لے کر اپنی راہ چل دی اور انسپکٹر صاحب مجھے لے کر اپنی راہ چل دئے اور دوسرے دن فاضل جج کی عدالت میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں انتہائی پُر اسرار اور خطرناک قسم کا عادی مجرم ہوں۔ دو بار پہلے کا سزا یافتہ ہوں اور کچھ معلوم نہیں کس وقت کیا کر بیٹھوں لہذا میرا باہر رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

اور فاضل جج نے خطرے کا قبل از وقت اندازہ لگاتے ہوئے مجھے چھ مہینے کی قید بامشقت کی سزا دے دی اور میں خوش ہوں کہ بالآخر مجھے مشقت کرنے کا موقع تو ملا!

ساجدہ عابد

رائی کا پربت

اُردو کا ایک مقولہ ہے

چیل اُڑی تو بھینس اُڑی

ظاہر ہے بھینس کو چیل کی طرح پر تو نہیں ہوتے اور اگر پر ہوتے بھی تو شاید بھینس اُڑ بھی نہ سکتی یا پھر وہ اس وقت چیل کی طرح چھوٹی ہوتی۔ بہر حال یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت کیا ہوتا۔ خیر بھینس اُڑے نہ اُڑے اتنا ضرور ہے کہ افواہیں ہوا میں اُڑ جایا کرتی ہیں اور یہ افواہیں بھی بغیر پر کے اُڑتی ہیں اس لئے کسی ایسی خبر کے لئے جس میں کوئی حقیقت نہ ہو کہا جاتا ہے کہ کیا بے پر کی اُڑائی ہے۔

کہاوتیں ہوں یا مقولے سماجی تاریخ میں ان کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اس لئے۔ کہ انسانی ذہن نے جب زندگی کے معاملوں سے متعلق سوچ بچار شروع کیا تو سماجی زندگی کے تجربوں سے بہت ساری حقیقتیں اس پر روشن ہوئیں اور ان ہی حقیقتوں نے کہاوت کی صورت اختیار کر لی۔

خیالات کے اظہار کا طریقہ ہر زمانے میں الگ الگ رہا ہے اور ہر زمانہ میں انسان کسی نہ کسی شکل میں اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی کچھ نہ کچھ راہ ضرور نکال لیتا ہے چنانچہ سماجی تخیل کے ابتدائی درجوں میں سماجی حقائق کہاوتوں کی صورت

میں نظر آتے ہیں اور یہ کہاوتیں صرف ادبی لحاظ سے اہم نہیں ہوتیں بلکہ اکثر اوقات زندگی کے تلخ اور خوش گوار حقائق کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں۔

یہ کہاوت کہ چیل اُڑی یا بھینس اُڑی یا بے پَر کی اُڑانا جیسے فقرے یا رائی کا پربت بنا دینا یا پھر کسی شاعر کی زبان میں ؏

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یا بات کا بتنگڑ بنانا اور ایسی ہی دوسری کہاوتیں اور مصرعے ایسے نہیں ہیں، جو کسی ایک فرد کی زبان سے نکلے اور فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ چونکہ ان کے پیچھے ایک مسلسل انسانی تجربہ ہے اور وہ نتیجہ ہیں زندگی اور اس کی حقیقت کے گہرے مطالعہ کا، اسی لئے وہ زبان زدِ خاص و عام ہو سکے اور آج سماجی تاریخ کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔

رائی کا پربت ہے تو ایک پرانی کہاوت لیکن اس میں بہت بڑی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں انسانی فطرت کے ساتھ انسانی عقل کی کم مائیگی پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ انسان غیر ضروری اور فضول باتوں پر توجہ دیتا ہے جن پر توجہ نہ دینی چاہیے۔ بیکار جھگڑوں میں وقت جیسی اہم دولت گنوا دیتا ہے اس طرح یقین نہ کرنے والی چیزوں پر یقین کر کے اپنے وقت کا خون کرتا ہے۔

انسانی فطرت کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے عیب اور کمزوریوں پر نظر رکھتا ہے اور اپنی برائیوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ چنانچہ انجیل میں کہا گیا ہے کہ،

"دوسروں کی آنکھ کے تنکے کو دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر ڈالو"

لیکن جب اپنی آنکھ میں شہتیر ہو تو ظاہر ہے انسان اندھا بن جاتا ہے اور اس اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے کی کوشش کرنے سے پہلے بہتر سمجھتا ہے کہ دوسروں

کی آنکھ پر ہی پردہ ڈال دیا جائے چنانچہ دوسروں کی آنکھ کے تنکے کو وہ شہتیر بنا دیتا ہے۔ اس لئے اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ خود کو کسی الزام سے بچانے کے لئے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے اور اس کے لئے اسے غلط بیانی کرنی پڑتی ہے۔ انفرادی حد تک غلط بیانی اور دروغ گوئی سے انسان اپنے آپ کو بچا لیتا ہے لیکن اجتماعی طور پر غلط بیانی کی دوسری شکل افواہ ہے جسے ملک اور قومیں استعمال کر کے ظاہرا طور پر بچاؤ مگر حقیقی طور پر تباہی کے سامان پیدا کرتی ہیں۔ سیاسی زبان میں اسے پروپگنڈہ کہا جاتا ہے اور آج پروپگنڈہ ہر ملک کی کامیابی کی جان ہے۔ یہ افواہوں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جسے ترقی یافتہ ممالک مہذب طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آج دنیا میں مہذب قسم کی پیچیدگیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں جس کا نتیجہ آئے دن جنگ کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں جنگ کوئی نئی چیز نہیں سوائے اس کے کہ پچھلی جنگوں میں اس کے اثرات محدود ہوتے تھے اور آج عالمی ہیں۔ باوجود اس تباہی کے خطرہ کے بڑے بڑے ممالک محض اپنے ذاتی مفاد کے لئے دنیا کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس تباہی کے سامان پیدا کرنے میں پروپگنڈہ ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار بنا ہوا ہے۔

انسانیت ویسے بھی ہمیں ہر جگہ پروپگنڈہ کے ہاتھوں میں کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پروپگنڈہ آج کل معاشی دنیا میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں پروپگنڈہ کی دوسری شکل اشتہار بازی ہے۔ اشتہار بازی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی مال زیادہ بکتا ہے۔ قسم قسم کی رنگینی پیدا کی جاتی ہے تو مال کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ لکس صابن اور پونڈس کریم کو مس فلاں نے استعمال کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر اشتہار میں ضرور لکھا جائے گا۔ ”میں ہمیشہ لکس صابن استعمال کرتی ہوں جس سے میری جلد صاف شفاف جھیل کے

مانند رہتی ہے۔"

"پیٹن ضرور پیا کیجئے۔ یہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک بخشتی ہے۔"

اس اشتہار بازی کی وجہ سے عوام کی ذہنیت کا دھارا زیادہ خریداری کے اصول کی طرف بہنے لگا ہے۔ جو زیادہ پروپگنڈہ کرتا ہے وہ تجارتی دنیا میں زیادہ کامیاب اور خوش حال رہتا ہے۔ خوش حال رہنے کے بھی بہت سے طریقے ہیں۔ طلب بڑھ گئی تو رسد روک دو۔ رسد بڑھ گئی ہے اور رسد بدستور باقی ہے تو مال چھپا دو یا تباہ کر دو۔ چنانچہ کنیڈا میں گیہوں کو اس لئے دریا برد کر دیا گیا تھا کہ گیہوں کی رسد بڑھ جانے سے قیمت کے گھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ برازیل میں کافی بھی اسی لئے جلادی گئی تھی کہ رسد کم ہو جائے اور قیمت بڑھ جائے۔

یہ بھی انسان کی عجیب فطرت ہے کہ وہ سیدھی سادی بات کو معمولی سمجھتا ہے اور معمولی بات کو پیچیدہ بنا دیا جائے تو اہم سمجھتا ہے۔ چنانچہ نظم ونسق میں دفترشاہی کا پیدا ہونا اس قسم کی ذہنیت کی مثال ہے۔ بہت سارے دفاتر میں کام خواہ مخواہ پیچیدہ اور اہم بنا دئے جاتے ہیں۔ بعض وقت آپ کے اختلافات کی بنا پر سرکاری معاملات کو طول دیا جاتا ہے اور بعض مرتبہ روایات کی پابندی کی بنا پر ایک دو ہفتہ کے کام کو ایک مہینے میں انجام دیا جاتا ہے۔

انسان قدرت کا شاہکار ہے۔ انسان دنیا میں نئی نئی چیزوں کی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ ایک طرف اس کے ارادے کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں جھک جاتی ہیں اور دوسری طرف وہ سماج کے ارادے اور خیال کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ سماج کی لعن طعن سے ڈر کر اپنی انفرادیت مٹا دیتا ہے۔ دنیا کو جیتنے والا، کائنات پر قابو پانے والا، ہواؤں کو مسخر کرنے والا، لوہے کو اپنے ارادوں کے سامنے موم بنانے والا انسان بعض موقعوں پہ بڑا بزدل اور کم ذور

بن جاتا ہے۔ رسم ورواج روایات کی سختی سے پابندی انتہائی ذہنی کھوکھلے پن کی مثال ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں حقیقی مذہبی اصولوں پر پابند نہ ہونا اتنا گناہ نہیں ہے جتنا رسم ورواج کو توڑنا ہے۔ سر سید نے اسی لئے یہاں رسوم ورواج کو مذہب قرار دیا تھا۔ لہذا سادہ اور سچے مذہبی اصولوں کو پیچیدہ کرنے کی وجہ سے بہت سی بے کار اور نقصان پہنچانے والی حرکات سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ جس سے ایک انسان کو ہی نہیں بلکہ سارے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔

غرض قوموں اور ملکوں کو چھوڑ کر روزمرہ زندگی میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ دوسروں پر کیچڑ اُچھالنے کی انفرادی کوششیں دن رات جاری رہتی ہیں۔ دو انسانوں کو لڑا دینا، دو دلوں میں انتقامی آگ بھڑکا دینا اسی قسم کی ذہنیت کا ثبوت ہے۔ کہنے والے تو دو بول کہہ دیتے ہیں جن کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن نفرت کا جو بیج دو دلوں میں بو دیا جاتا ہے وہ ایک تنا ور درخت بن کر انسان کی زندگی کو کھوکھلا بنا دیتا ہے چنانچہ ہندی کا ایک دوہا ہے ؎

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو جھٹکائے
ٹوٹے میں پھر نا جوڑے جوڑے گانٹھ پڑجائے

تبصرے

جب لوہا پگھلتا ہے   از ہربنس دوست

مکتبۂ ارژنگ، پشاور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔قیمت:۔ دو روپے

ہربنس دوست اُردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ ان کے افسانے برسہا برس سے زندگی کی عکاسی فنکارانہ انداز میں کر رہے ہیں۔ آج جب ادب میں عدم مقصدیت پر زور دیا جا رہا ہے وہ عصری مسائل کی ترجمانی سے اپنا منھ نہیں موڑنا چاہتے چنانچہ اُن کا زیرِ نظر ڈراما "جب لوہا پگھلتا ہے" محنت اور سرمایہ کی کش مکش ہی کے موضوع پر لکھا گیا ہے جس کا اُنھیں ذاتی تجربہ ہے۔ چار ایکٹ کا یہ ڈراما فیکٹری کے گرد پیدا ہونے والے مسائل کو بڑے پُراثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ ٹکنیکی نقطۂ نظر سے اس میں بعض تجربے بھی کئے گئے ہیں لیکن شاید انھیں موجودہ مختصر اسٹیج پر پیش کرنا آسان نہ ہو۔ ایک ہی منظر میں کئی مناظر، ایک ہی وقت میں کئی واقعات اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ ایکٹ کو مناظر میں تقسیم کرنے کی زحمت نہ ہو اور ایک ہی وقت، ایک ہی سِٹ پر کئی چیزیں سامنے آجائیں لیکن کامیابی کے ساتھ ان کی پیش کش مشکل پیدا کر سکتی ہے۔ ایک بات اور جو کھٹکتی ہے، موضوع سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں سرمایہ دار کے اندر اچانک جو تبدیلی دکھائی گئی ہے وہ قرینِ قیاس تو ہے، ڈرامے کے انقلابی آہنگ کو کمزور اور بے اثر کر دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی درمیانی لوگ، خود غرض لیڈر، یونین کے کمزور رہنما غلطیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں یا جان بوجھ کر انقلابی تحریک کو غلط راستوں پر ڈال دیتے ہیں لیکن اس ڈرامے میں جس طرح یونین کے بے ایمان لیڈر کے مقابلے میں مِل کے مالک کو پیش کیا گیا ہے وہ ڈرامائی ہونے کے باوجود کمزور ہے۔ پھر بھی کئی حیثیتوں سے اس ڈرامے میں مزدور زندگی کے کچھ مناظر بڑی دلکشی سے پیش کئے گئے ہیں۔

سید احتشام حسین

۲- یاس یگانہ چنگیزی از راہی معصوم رضا

شاہین پبلشرس، ۶۳۷ حسن منزل، الہ آباد قیمت: چھ روپے

جدید اُردو غزل کی تاریخ میں یگانہ کا خاص مقام ہے لیکن اس مقام کے تعین میں خاص اُلجھنیں ہیں کیونکہ وجوہ کسی قسم کے ہوں، جب ایک دفعہ قبولِ عام کی سند ملنے سے رہ جاتی ہے تو اسباب کی وضاحت کے بعد بھی اُسے حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یگانہ کی زندگی میں بہت کم، مرنے کے بعد کئی نقادوں نے ان ناانصافیوں اور متعصبانہ روّیوں کا تجزیہ کیا جو یگانہ کے ساتھ زمانے نے روا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سارے تجزیے درست نہیں ہیں لیکن پھر بھی ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خود یگانہ کے اپنے کردار، کچھ جائز و ناجائز اختلافات، کچھ زمانے کے تقاضے اور کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر نے مل کر اُن کی شاعرانہ حیثیت کو نقصان پہنچایا۔ اس پر سب سے زیادہ بھرپور اور مدلل بحث راہی معصوم رضا نے کی ہے جو زیرِ نظر کتاب کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ اگرچہ کئی دوسرے لکھنے والوں کی طرح راہی کے انداز میں بھی وکالت کے ساتھ کسی قدر جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی ہے لیکن اُن کے بیان میں دل کشی کے ساتھ مسائل کو سمجھنے کی ہمدردانہ کوشش بھی ہے۔ راہی نے یاس عظیم آبادی کے یگانہ چنگیزی بننے کی نفسیاتی بنیادیں تلاش کرنے میں جس کاوش سے کام لیا ہے وہ اُن کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کی دلیل ہے تاہم اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یگانہ خود اپنے سب سے بڑے دُشمن تھے، اُنھوں نے اپنی انفرادیت کو انانیت میں، اپنی خودداری کو اکڑ میں اور اپنے کھرے پن کو دوسروں کی تذلیل اور اذیت پسندی میں تبدیل کر لیا تھا۔ بڑا فن کار دوسروں کو گرا کر بڑا نہیں بنتا، بڑا بنتا ہے تو دوسرے خود گر جاتے ہیں۔ یگانہ نے اپنی ساری جد و جہد کا رُخ غالب، اقبال، جوش اور دوسرے شعراء کو جھوٹا ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس سے اُن کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچا۔ راہی معصوم رضا نے یگانہ کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ

زور دے کر ایک قسم کی مدلّل مداحی کا انداز اختیار کر لیا ہے، حالانکہ اُنھوں نے اُن کی شاعری کے جن محاسن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خود اپنی جگہ یگانہ کی اہمیت کے بہت بڑے دلائل ہیں، انھیں کو تفصیل سے پیش کر دینا کافی تھا۔

راہی کی یہ کتاب یگانہ پر پہلی اہم کتاب ہے جو اُن کی زندگی، شاعری اور تفسیرِ حیات پر گراں قدر خیالات پیش کرتی ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سا مواد عصری تحریروں سے یکجا کیا گیا ہے اور ادبی انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ تقریباً ساٹھ صفحات کے انتخاب کلام نے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے اور مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔ سیّد احتشام حسین

مِتنی تنقید از ڈاکٹر خلیق انجم

ادارہ خرام پبلی کیشنز، حوض قاضی، دہلی ۶ قیمت:۔ ساڑھے چار روپے

اُردو کے نئے محقق اور نقاد اُستادوں میں ڈاکٹر خلیق انجم کے قدم تیزی اور استقامت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شیخ چاند کے بعد مرزا محمد رفیع سودا پر ایک مبسوط محققانہ کتاب لکھ کر اُنھوں نے اپنی جگہ علمی حلقوں میں محفوظ کر لی ہے۔ موجودہ کتاب اُن کی محنت پسند طبیعت کا نیا ثمر ہے۔ یوں تو تحقیقی ادب کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے لیکن اُردو میں تحقیق کا بازار گذشتہ پچاس سال میں گرم ہوا ہے۔ یہ بھی انفرادی ذوق اور شخصی میلان کا نتیجہ رہا ہے۔ اس کے اصول و ضوابط معین کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ جب یونی ورسٹیوں سے باقاعدہ تحقیقی کاموں پر سندیں دی جانے لگیں اُس وقت بھی اصولِ تحقیق منضبط کرنے کی جانب توجہ نہیں کی گئی حالانکہ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں کتب خانوں کی ترتیب سے لے کر تحقیقی مواد کے پریس پہنچنے تک، ہر پہلو پر لاتعداد کتابیں مل جاتی ہیں۔

ایسے میں ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب اُردو کے لئے ایک لغت ہے۔ چند مضامین سے قطع نظر کر لیا جائے تو متن کے مرتب کرنے کے اُصولوں سے متعلق اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے خلیق انجم نے متنی تنقید کے ضوابط کے متعلق گو بہت اختصار سے کام لیا ہے لیکن ضروری مسائل کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ متن کی تصحیح کے سلسلہ میں بنیادی نسخہ کے تعین اور موازنے کے طریقہ پر جو کچھ لکھا ہے اُس میں کسی قدر اُلجھاؤ ہے اگرچہ اُن کے درست ہونے میں شبہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حصّہ کسی قدر اور واضح ہونا چاہیئے تھا۔ چونکہ تحقیق کے تمام پہلو اس کتاب میں پیش نظر نہیں ہیں بلکہ متن مرتب کرنے کے سلسلہ کے مباحث ہی پر زور دیا گیا ہے اس لئے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ اس میں تحقیق کے ہر مسئلہ پہ بحث کی گئی ہوگی، تاہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ضمناً سبھی اہم پہلوؤں کی جانب اشارے کر دئے گئے ہیں۔ مجھے "متنی تنقید" بہت مفید کتاب معلوم ہوئی اور یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے ہمارے نئے محقق استفادہ کریں گے۔ سیّد احتشام حسین

پیام تعلیم ذاکر نمبر۔ جامعہ ملّیہ اور پیام تعلیم کے وجود میں ذاکر صاحب کا خونِ جگر اس طرح شامل ہے کہ سب ایک ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔ ذاکر حسین صاحب کا جمہوریہ ہند کا صدر ہونا ہندوستان کے بسنے والوں کے لئے کسی حد تک معروضی اور غیر شخصی ہو سکتا ہے لیکن پیام تعلیم کے لئے شخصی اور نجی مسرت کا حامل ہے اس لئے یہ بات فطری تھی کہ پیام تعلیم ذاکر نمبر شائع کرے۔ یہ نمبر ذاکر صاحب کو ایک انسان اور معلّم کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ مضمون نگاروں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ ایک طرف ان کی شخصیت کے اُن تعلیمی پہلوؤں کو پیش کیا جائے جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اور دوسری طرف یہ کہ انھیں ایسی زبان میں پیش کیا جائے جس سے پیام تعلیم کا مقصد بھی پورا ہو یعنی اس کے مطالعہ کرنے والے نوخیز طلبا اس سے استفادہ کر سکیں۔ یہ نمبر اس حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔ اس میں اکثر مضامین اُن حضرات کے ہیں جو جامعہ کی برادری میں شامل ہیں یا اس سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اس لئے ان میں خلوص، یگانگی اور احترام کے ساتھ ساتھ علمی انداز بھی پایا جاتا ہے۔

اس خاص نمبر کے اکثر مضامین نہ صرف دلچسپ بلکہ معیاری بھی ہیں، مجھے یقین کہ بعض حیثیتوں سے یہ نمبر بھی ذاکر صاحب کے متعلق ایک اہم دستاویز کا کام دے گا۔ سیّد احتشام حسین

نثر و غزل دستہ

شاد عارفی کے تنقیدی مضامین، شاہکار نظمیں، غیر مطبوعہ قطعات
اور رباعیات کا مجموعہ

مُرتبہ مظفؔر حنفی

قیمت آٹھ روپے

یاس یگانہ چنگیزی

از راہی معصوم رضا

تنقیدی ادب میں لازوال اضافہ، جس نے تنقید کے ہر طالب علم کی رسائی یگانہ کی روح تک ممکن بنادی۔ ادب کے ہر طالب علم کے پاس اس کا محفوظ ہونا بے حد ضروری ہے

تاجران کتب کو معقول کمیشن پیش کیا جائے گا

تقسیم کار:- مکتبہ شاہکار۔ ۱۳۴، بخشی بازار، الہ آباد ۳

مجموعے نظم و غزل

کتاب	مصنف	قیمت
اوراقِ مصور	سکندر علی وجد	7/=
پتھروں کا مغنی	وحید اختر	6/=
لہر لہر ندیا گہری	زبیر رضوی	3/=
انتخاب کلامِ فراق	مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی	1/=
نثر و غزل دستہ	شاد عارفی	8/=
چاندنی اساڑھ کی	راج نرائن رازؔ	3/=
جاوداں	جاں نثار اختر	3/=
اذکار خوشتر	ڈاکٹر ممتاز خوشتر	10·50
نقش جاوداں	پرنس نقی علی ثاقب	3/=
گل افشانیاں (نعتیہ کلام)	ڈاکٹر خوشتر	1/=
موجِ صبا	فیض الحسن خیال	1/=
پرانے موسموں کی آواز	کمار پاشی	2·50

افسانوی مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
خیالستان	سجاد حیدر یلدرم	3·75
دامِ خیال	رئیس احمد جعفری	4/=
کالے صاحب	اپیندر ناتھ اشک	2·50
اینٹ کا جواب	منظفر حنفی	4/=
کاجل اور دھواں	بشیشر پردیپ	3·50

رپورتاژ

کتاب	مصنف	قیمت
روشنی کے پھول	اکرام جاوید	4/=
عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک	عاتق شاہ	1/=

تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
حاشئے	فراقؔ گورکھپوری	1·50
یاس یگانہ چنگیزی	راہی معصوم رضا	6/=
تنقید و تجزیہ	ابو محمد سحر	3/=
تحقیق و تنقید	اختر اورینوی	3·75
فراق نمبر	ماہنامہ شاہکار	5/=

ناولیں

کتاب	مصنف	قیمت
چار دل چار راہیں	خواجہ احمد عباس	3·50
ضدی	عصمت چغتائی	2·50
صوفیہ	اے آر خاتون	5·50
صاعقہ	رضیہ بٹ	6/=
منصور موہنا	شررؔ لکھنوی	2·25
نیلی کا کھیل	شررؔ لکھنوی	1·50
اسپین کی شہزادی	صادق حسین سردھنوی	5·50
دلھن کی سیج	جبران خلیل جبران	3·50
فرخندہ	رئیس احمد جعفری	10/=
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	2·50
گہرے داغ	ابنِ حیات	4·50
جلوۂ ایثار	منشی پریم چند	4/=
کشوری	ابنِ حیات	5/=

کوئی سی تین کتابوں کی قیمت منی آرڈر سے بھیجنے پر محصول ڈاک معاف۔

SHAHKAR
Allahabad.

No. 54

ماہنامہ
ادبی ڈائجسٹ
شاہکار

اپنے دورِ جدید میں ہر سال
دو خاص نمبر پیش کرنے کا
اعلان کرتا ہے

ادبی
تحقیقی
تصویر
نمبر

نمبر کے حسین انتخاب میں

ناولٹ

برسوں کا
ریکارڈ
توڑ

قیمت ۳ روپے

ضخامت تقریباً
۳۵۰ صفحات

جنوری ۶۸ء میں شائع
ہو رہا ہے

لکھنے والے
شوکت صدیقی
اقبال متین
جمیلہ ہاشمی
اور
جیلانی بانو
جنکی آواز وقت کی
بیکراں وسعتوں میں
گونجتی ہے

دوسرا خاص نمبر جو جون جولائی ۶۸ء کا مشترکہ شمارہ ہوگا

احتشام حسین
نمبر

ضخامت
ساڑھے پانچ سو
صفحات

قیمت
۵ روپے

۳۱ جنوری ۶۸ء تک گیارہ روپے منی آرڈر سے بھیجکر
سالانہ خریدار بننے والے یہ دونوں نمبر رجسٹری سے اور باقی عام
شمارے سادہ ڈاک سے حاصل کر سکیں گے۔

مشتہرین فوراً
مقصود عام کیلئے اپنی جگہ محفوظ کرالیں
اور تاجران کتب مطلوبہ تعداد کیلئے
فوراً لکھیں

مینیجر شاہکار، ۱۳۱/۱۴- بخشی بازار، الہ آباد-۳

TaSa Job Printers Alld. 3